۱ میری دعا

صفؔی اورنگ آبادی

پیشِ درس

مناجات اُردو نظم کی ایک موضوعی صنف ہے۔ مناجات کے معنی دعا، عرض اور التجا کے ہوتے ہیں۔ وہ نظم جس میں شاعر اپنی عاجزی، انکسار اور عجز کے ساتھ خدا کی بزرگی بیان کرکے برائیوں اور گناہ سے نجات کی دعا کرتا ہے، مناجات کہلاتی ہے۔ مناجات میں شاعر خدا کے حضور اپنی بندگی کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی بے بضاعتی اور حاجات کا اظہار کرتا ہے۔ ہمارے شعرا نے نظم کے پیرایے ہی میں مناجات کہی ہیں۔ عام طور پر حمد اور مناجات میں معنی و مفہوم کے لحاظ سے امتیاز نہیں کیا جاتا لیکن حمد اور مناجات میں فرق ہوتا ہے۔ حمد میں شاعر خالصتاً خدا کی تعریف کرتا ہے جبکہ مناجات میں خدا کی تعریف کے ساتھ اس کے حضور اپنی ضروریات بھی پیش کرتا ہے۔ اگرچہ خدا ہمارے دلوں کے حال جانتا ہے لیکن مناجات میں دعا کرتے وقت شاعر اپنے دل کی کیفیت، اپنی بے بسی، اپنی مجبوری اور اپنے حالات کی خرابی کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے حالات کی بحالی کا طالب ہوتا ہے۔

جان پہچان

صفؔی کا اصل نام بہاء الدین صدیقی تھا۔ ان کی پیدائش اورنگ آباد میں ۱۲؍فروری ۱۸۹۳ء کو ہوئی۔ ان کے والد حکیم محمد منیر صفؔی کو طبیب بنانا چاہتے تھے لیکن صفؔی نے درمیان ہی میں تعلیم چھوڑ کر ملازمت شروع کردی۔ انھوں نے کئی ملازمتیں اختیار کیں لیکن ان کا زیادہ رجحان شاعری کی طرف تھا۔ اس فن میں ان کے بہت سے شاگرد بھی تھے۔

صفؔی اورنگ آبادی داغؔ دہلوی کے بعد اُردو شاعری کے ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے محاورات، ضرب الامثال اور نئے شعری اظہار کو بہ حسن و خوبی برتا۔ سلاست، شگفتگی اور برجستگی ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ صفؔی کا انتقال حیدرآباد میں ۲۱؍ مارچ ۱۹۵۴ء کو ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں ان کے شاگرد خواجہ شوقؔ نے ان کا مجموعۂ کلام 'پراگندہ' کے نام سے شائع کیا۔

تو وہ ہے جو ہر ایک کی بگڑی سنوار دے
میری مراد بھی ، مرے پروردگار ، دے

کونین میں ذلیل نہ کر سب کے روبرو
ایمان و عیش و دولت و عزّ و وقار دے

تیرا یہ حکم ، مانگ ہر اک چیز مجھ سے مانگ
میری دُعا کہ دے ، مرے پروردگار ، دے

دل کو مرے ہر ایک طرح مطمئن بنا
غم دے تو غم کے ساتھ کوئی غمگسار دے

آنکھوں کو ایسی لذتِ دیدار ہو نصیب
ہر دَم جو مجھ کو کیفِ مئے خوشگوار دے

محفوظ رکھ فریبِ سفید و سیاہ سے
گردش نہ مجھ کو گردشِ لیل و نہار دے

دُنیا میں کچھ بھی قدرِ محبت نہیں رہی
نالہ جگر گُداز و نَفَس شعلہ بار دے

داتا کی شان یہ ہے کہ جاری ہو اُس کی دین
سائل کا شیوہ یہ ہے کہ دامن پسار دے

مطلب سمجھ میں آئے بقائے دَوام کا
ایسا سبق یہ زندگیِ مستعار دے

میں بار بار مانگوں جو درکار ہو مجھے
اور اپنے فضل سے تو مجھے بار بار دے

حسنِ طلب میں مجتہدِ عصر ہے صفؔی
وہ تجھ سے ایک مانگے ، توؔ اُس کو ہزار دے

معانی و اشارات

کونین	-	دونوں جہان
عیش	-	آسودگی، فراغت، راحت
کیف	-	نشہ
جگر گداز	-	متاثر کرنے والا
بقائے دوام	-	ہمیشہ کی زندگی
زندگیِ مستعار	-	عارضی زندگی
حسنِ طلب میں مجتہدِ عصر ہے		مراد خدا سے مانگنے میں شاعر نئے نئے طریقے اختیار کرتا ہے

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

ا۔ مناجات سے موزوں لفظ تلاش کر کے خاکہ مکمل کیجیے۔

ذِلت سے بچانے والی چیزیں

۲۔ مناجات سے موزوں لفظ تلاش کر کے خاکہ مکمل کیجیے۔

شاعر کی طلب

نفس		آنکھ	
غم		دل	

۳۔ مناجات پڑھ کر ذیل کے خاکے میں متعلقہ الفاظ لکھیے۔

لذت	فریب	گردش	نالہ

* مناجات کے مصرعوں کے حوالے سے خاکے میں موزوں جملہ/فقرہ لکھیے۔

خدا کی صفت ←

خدا کا حکم ←

میری دعا ←

سائل کا شیوہ ←

زندگیِ مستعار کا سبق ←

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

ا۔ مناجات میں اللہ تعالیٰ سے جن باتوں کی التجا کی گئی ہے، انھیں تفصیل سے لکھیے۔

۲۔ دنیا میں قدرِ محبت کی بقا کے لیے شاعر کی خواہش تحریر کیجیے۔

۳۔ مناجات کی روشنی میں خدا کی صفات کے بارے میں لکھیے۔

۴۔ حفاظت سے متعلق شاعر کی التجا کو بیان کیجیے۔

۵۔ دنیا سے متعلق شاعر کے احساس اور دعا کو لکھیے۔

* درج ذیل اشعار کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

ا۔ محفوظ رکھ فریبِ سفید و سیاہ سے
گردش نہ مجھ کو گردشِ لیل و نہار دے

۲۔ مطلب سمجھ میں آئے بقائے دوام کا
ایسا سبق یہ زندگیِ مستعار دے

۳۔ میں بار بار مانگوں جو درکار ہو مجھے
اور اپنے فضل سے توؔ مجھے بار بار دے

۴۔ حسنِ طلب میں مجتہدِ عصر ہے صفؔی
وہ تجھ سے ایک مانگے، تو اس کو ہزار دے

٭ درج ذیل مصرعے پر ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

دنیا میں کچھ بھی قدرِ محبت نہیں رہی

٭ ہدایات کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ بقائے دوام اور زندگیِ مستعار جیسی ترکیبوں کے بارے میں لکھیے۔

۲۔ مناجات سے صنعتِ تضاد کا شعر تلاش کر کے لکھیے۔

٭ درج ذیل فقروں کے لیے صرف ایک مصرعہ لکھیے۔

۱۔ کونین سے متعلق شاعر کی دعا

۲۔ دانائی کی شان

۳۔ بقائے دوام کو سمجھنے کے لیے شاعر کی التجا

۴۔ شاعر کا حسنِ طلب

سرگرمی/منصوبہ:

مشہور شعرا کی چند مقبول مناجات کا البم تیار کیجیے اور مناجات پر جامع تبصرہ لکھیے۔

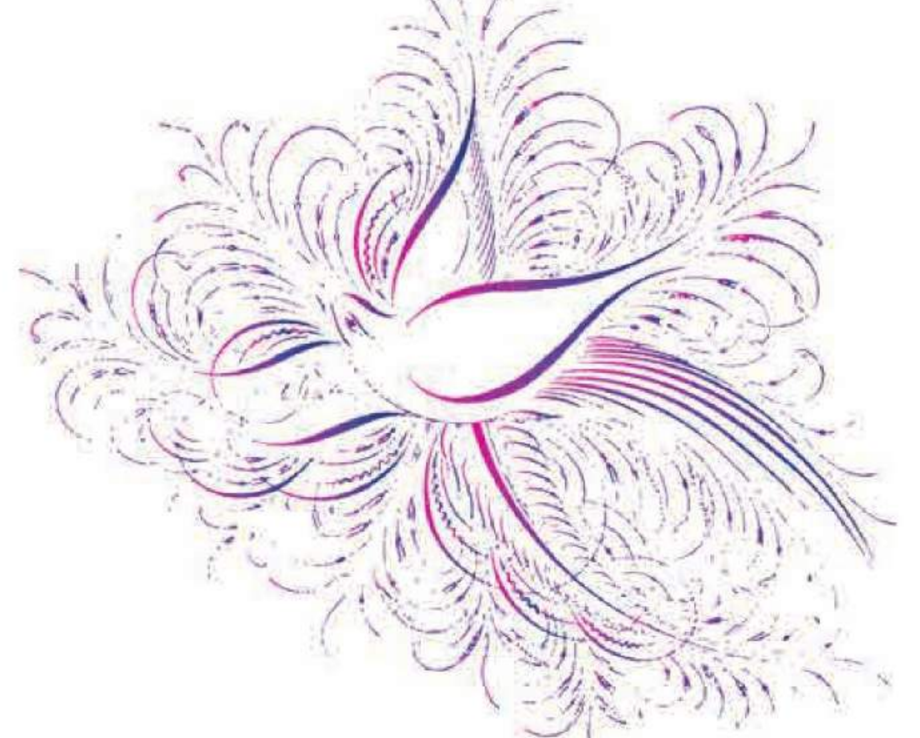

۲ خیر صفاتِ رسولؐ

صبیح رحمانی

پیش درس

نعت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کو کہتے ہیں۔ اس میں آپؐ کے اوصاف بیان کیے جاتے ہیں۔ آپؐ کی سیرت، حالاتِ زندگی، معمولات اور ولادت اور وفات کے احوال منظوم کیے جاتے ہیں۔ نعت نگاری کی ابتدا عربی شاعری میں حضورؐ کے زمانے سے ہوگئی تھی۔ اُس زمانے کے نامور عرب شعرا نے آپؐ کی شانِ اقدس میں اشعار کہے، قصیدے لکھے۔ نعت نگاری کی روایت عربی اور فارسی سے ہوتی ہوئی اُردو میں پہنچی۔ اُردو میں بعض ایسے شعرا بھی ہوئے ہیں جنھوں نے صرف نعت ہی پر طبع آزمائی کر کے شہرت حاصل کی۔ حضورؐ کی تعریف و توصیف میں عقیدت شامل ہوجانے کی وجہ سے تقدیسی شاعری میں نعت کو بلند مقام حاصل ہے اور نعتیہ اثاثے کو مقدس مانا جاتا ہے۔

اُردو میں نور نامے، میلاد نامے، معراج نامے، وفات نامے، منظوم سیرتِ رسولؐ اور غزوات سے متعلق جنگ نامے نعتیہ شاعری کے موضوعات رہے ہیں اور قدیم ادب سے آج جدید ادب تک ان موضوعات پر مسلسل لکھا جاتا رہا ہے۔ شروع میں مثنوی کے ایک جزو کے طور پر اُردو میں نعتیں لکھی گئیں۔ پھر آپؐ کے حالاتِ زندگی اور واقعات کو مثنویوں میں پیش کیا جانے لگا۔ ایسی نعتیہ مثنویوں کی ایک روایت اُردو ادب میں دکھائی دیتی ہے۔ ان نعتیہ مثنویوں کے موضوعات واقعۂ معراج، آپؐ کی سیرت سے جڑے قصے وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ بعد میں خالص نعتیں لکھی جانے لگیں اور کئی اہم شعرا کے نام سامنے آئے۔

جان پہچان

سیّد صبیح رحمانی ۲۷ رجون ۱۹۶۵ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد کا تعلق مہاراشٹر کے شہر بیڑ سے تھا۔ صبیح نے بی.اے. سیاسیات میں اور ایم.اے. اُردو میں کرنے کے بعد ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کے محکمے میں ملازمت اختیار کی۔ انھیں بچپن ہی سے نعت خوانی کا شوق رہا۔ پھر نعت نگاری کی طرف توجہ کی اور مولانا تیّر مدنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ 'ماہِ طیبہ'، جادۂ رحمت، خوابوں میں سنہری جالی ہے اور سرکارؐ کے قدموں میں' ان کے نعتیہ مجموعے ہیں۔ شاعری کی طرح نثر میں بھی صبیح رحمانی کی نعتیہ ادب پر بہت سی کتابیں شائع ہوچکی ہیں لیکن نعتِ رسولؐ کے فروغ کے سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'نعت رنگ' کی اشاعت ہے۔ یہ ضخیم رسالہ گزشتہ ۲۲-۲۰ برسوں سے بلا ناغہ نکل رہا ہے اور تقدیسی ادب میں اس کی علٰحدہ شناخت قائم ہے۔

صبیح رحمانی کو نعت نگاری سے والہانہ محبت ہے۔ اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے وہ کئی نعتیہ رسائل کی مجلسِ ادارت میں شریک ہیں۔ نعت خوانی کے لیے انھیں بیرونی ممالک بھی بلایا جاتا ہے۔ نعتیہ ادب پر ان کی مجموعی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں 'تمغۂ امتیاز' سے نوازا گیا ہے۔ ہند و پاک اور بیرونِ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں صبیح رحمانی کی نعتیہ و ادبی خدمات پر تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں۔

سرد ہُوا نفرت کا جہنم ، کھلے پیار کے پھول
وہ آئے تو وحشی لمحے سب ٹھہرے معزول
خیر صفات رسولؐ

وہ جو چلے تو عرش سے پہنچا ان کو حرفِ سلام
ان سے پہلے کب کوئی بندہ تھا قوسین مقام
اُن کی عظمت کے آگے ہیں سب کی انائیں دھول
خیر صفات رسولؐ

اُن سے پہلے کس نے دیکھے رحمت کے یہ رنگ
لب پہ دعاؤں کی خوشبو ہے ، جسم پہ بارشِ سنگ
راہ میں کانٹے بچھانے والے پائیں دعا کے پھول
خیر صفات رسولؐ

اُن سے حسنِ خُلق عبارت ، وہ ہی نورِ سُبُل
خیر کا مرجع ، رحم کا پیماں یعنی ختمِ رُسُل
عفو ، محبت اور سچائی جن کے خاص اُصول
خیر صفات رسولؐ

حسنِ عمل کی بات نہیں ہے ، یہ ہے کرم کی بات
حرف صدائیں دیتے ہیں جب لکھتا ہوں میں نعت
لکھواتے ہیں مجھ سے ، مدحت ہوتی ہے مقبول
خیر صفات رسولؐ

معانی واشارات

خیر صفات	-	نیک صفات
وحشی لمحے	-	مرادزمانۂ جاہلیت
معزول	-	ختم
قوسین مقام	-	مرادرسول اللہؐ
دھول ہونا	-	اہمیت ختم ہونا
حسنِ خُلق	-	اچھے اخلاق
سُبُل	-	سبیل کی جمع، راستے
نورِ سبل	-	مراداللہ کے راستوں کی روشنی (ہدایت)
خیر کا مرجع	-	نیکی کے لیے جس کی طرف رجوع کیا جائے، مرادرسول اللہؐ
عفو	-	معافی
مدحت	-	تعریف

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ نظم سے موزوں لفظ تلاش کر کے خاکہ مکمل کیجیے۔

	صفاتِ رسولؐ	

۲۔ لفظی تراکیب پر مبنی خاکہ مکمل کیجیے۔

	لفظی تراکیب	

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ آپؐ کی عظمت کے آگے 'سب کی انائیں دھول' کا مفہوم تحریر کیجیے۔

۲۔ دوسرے بند میں آپؐ کی زندگی کے جس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُسے مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ تیسرے بند میں رسولِ اکرمؐ کے عفو و درگزر کی جو مثالیں آئی ہیں ان کی وضاحت کیجیے۔

۴۔ قرآن کریم کی وہ آیت تحریر کیجیے جس کے مفہوم کو تیسرے بند میں بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ ''اُن سے پہلے کب کوئی بندہ تھا قوسین مقام' یہ مصرعہ جس واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے، اسے چند جملوں میں تحریر کیجیے۔

* درج ذیل کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۱۔ سرد ہُوا نفرت کا جہنم، کھلے پیار کے پھول
وہ آئے تو وحشی لمحے سب ٹھہرے معزول
خیر صفات رسولؐ

۲۔ اُن سے حسنِ خُلق عبارت، وہ ہی نورِ سُبُل
خیر کا مرجع، رحم کا پیماں یعنی ختمِ رُسُل
عفو، محبت اور سچائی جن کے خاص اُصول
خیر صفات رسولؐ

* ہدایات کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ نعتِ رسولؐ سے صنعتِ تضاد کے مصرعے تلاش کر کے لکھیے۔

۲۔ پہلے بند کی صنعتِ تلمیح کو وضاحت کے ساتھ قلم بند کیجیے۔

۳۔ نعتِ رسولؐ کے قافیوں کو معنی کے ساتھ تحریر کیجیے۔

۴۔ اس نعت میں آنے والی تلمیحات تلاش کر کے لکھیے۔

سرگرمی/منصوبہ:

۱۔ اس نظم میں بیان کی گئی اللہ کے رسولؐ کی صفات کے علاوہ مزید صفات سیرت کی کسی کتاب سے تلاش کر کے لکھیے۔

۲۔ سیرتِ رسولؐ پر لکھی ہوئی کوئی دو کتابوں اور ان کے مصنّفین کے نام لکھیے۔

۳ بیان کنچن پٹن کے بادشاہ اور اس کے خواب کا

ابنِ نشاطی

پیش درس

مثنوی عربی لفظ ہے۔ اس کا مصدر 'مثنیٰ' ہے جس کے معنیٰ 'دو' کے ہوتے ہیں۔ اس مسلسل نظم کو مثنوی کہتے ہیں جس کے ہر شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ پوری نظم کا وزن ایک ہوتا ہے۔ شعروں کی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔ ہر شعر میں قافیہ بدلنے کی وجہ سے مثنوی نگار کو یہ سہولت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اشعار کہہ سکے۔ مثنوی کی شکل میں جو ضخیم داستانیں پائی جاتی ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ مثنوی نگار ایک طرح کے قافیوں کا پابند نہیں ہوتا، وہ ہر شعر کے دونوں مصرعوں میں نئے نئے قافیے استعمال کرتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کا آزادانہ مظاہرہ کرتا ہے۔ اُردو کی پہلی مثنوی فخر الدین نظامی کی 'کدم راؤ پدم راؤ' ہے۔ اس کے بعد کے شعرا میں میر تقی میرؔ، میر حسنؔ اور دیا شنکر نسیمؔ نے اس فن کو آگے بڑھایا۔

مثنوی بیانیہ شاعری ہے۔ اس میں فلسفہ، تصوف، تاریخ اور قصہ کہانی کے متن کو بیان کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ہماری روایتی مثنویوں میں کوئی عشقیہ قصہ کسی ملک کے حوالے سے بیان کیا جاتا تھا اس لیے اس ملک کی سماجی، سیاسی اور معاشرتی ماحول کی عکاسی بھی یہاں ضروری تھی۔ چنانچہ مثنوی جس ملک یا شہر میں واقع ہو رہی ہے اس کی حدودِ اربعہ، مکانات، باغات، راستے غرض شہر کا تعارف مثنوی کی روایت میں شامل تھا۔ ابنِ نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' میں شہر کنچن پٹن کا تذکرہ آیا ہے۔ شاعر نے اس سونے کے شہر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ اس شہر کا بادشاہ بھی نامور، بااخلاق اور رعایا کا خیال رکھنے والا تھا۔ مثنوی میں شام اور رات ہونے کے مناظر بڑی خوب صورتی سے بیان کیے گئے ہیں۔

جان پہچان

ابنِ نشاطی کا اصل نام شیخ محمد مظہر الدین تھا۔ ان کے سنہ پیدائش میں اختلاف ہے۔ اُن کی ولادت کا سال ۱۶۳۱ء اور ۱۶۳۵ء کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ ابنِ نشاطی گولکنڈہ کے رہنے والے تھے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے۔ انھیں فارسی زبان پر خاصی قدرت حاصل تھی۔ وہ اپنے زمانے کے مقبول مثنوی نگار تھے۔ مثنوی کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی 'پھول بن' فارسی قصوں کے مجموعے 'بساتین الانس' کا بامحاورہ اور سلیس دکنی ترجمہ ہے۔ حسنِ بیان اور اثر آفرینی نے اس مثنوی کو اُردو ادب میں مقبول کر دیا۔

ابنِ نشاطی کی تمام تر شہرت اُن کی مثنوی 'پھول بن' کی وجہ سے ہے۔ یہ مثنوی لفظی اور معنوی خوبیوں سے پُر ہے۔ مثنوی میں ابنِ نشاطی نے جو زبان استعمال کی ہے وہ کسی حد تک فارسی آمیز ہے اس کے باوجود اس میں دکنی مزاج اور میلان کا پتا چلتا ہے۔ دکنی ادبیات میں ایسی مثنویوں کی کمی نہیں جو مقامی قصوں سے ماخوذ ہیں لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے جو مخلوط معاشرت پیدا ہوئی تھی اور اس کا جو اثر اپنے زمانے کے قصوں پر پڑا، دکنی مثنویوں میں اس کی بھرپور اور کامیاب نمائندگی مثنوی 'پھول بن' میں نظر آتی ہے۔

کَتے یک شہر مشرق کے کَدَن تھا — کہ اس کا نانْوں سوں کنچن پٹن تھا
کنْچن کے تھے محل، کنچن کی دیوار — کنْچن پر پھر کنْچن لیپے تھے ہر ٹھار
کنْچن کی تھی زمیں کنچن کے جھاڑاں — گھراں کنچن کے ، کنچن کے کواڑاں

گگن کے تل کیں ایسا شہر نادر
نہیں دیکھے تھے انکھیاں کے مسافر

عجب تاثیر تھا واں کی ہوا کا
سدا ہنگام تھا نشو و نما کا

ُسکی لکڑی اگر کُئی لاکو گاڑے
وو لکڑی سبز ہو شاخاں کوں کاڑے

بکھیرے تو زمیں پر واں کی کانٹے
تھے پھُٹتے پل میں پھولاں کے ہو چھانٹے

سدا خوش حال تھے سب لوگ واں کے
تھے خاطر جمع، واں کے ساکناں کے

جِتا لیوے بی ، عشرت کم نہ تھا واں
اتھا سب کچھ ولے یک غم نہ تھا واں

اتھا اس شہر کا اک نامور شاہ
سُلکّھن سلطنت کے برج کا ماہ

شہاں میں جگ کے اس کوں سروری تھی
جگت کے سروراں میں برتری تھی

اطاعت میں تھے اس کے تاج داراں
تھے اس کے ضبط میں سب شہر یاراں

نہ تھا ثانی اوسے روئے زمیں پر
تھے اس کے حکم میں سب بحر ہور بر

جو کُئی ہو خار آوے شاہ کے گھر
تو گُل کے ناد دامن ہووے پُر زر

جو کُئی باتاں کی سیپیاں کؤں پسارے
کرے مطلب کے پُرموتیاں وو سارے

لیا سو عدل کا نور آپ نے ہات
نہ تھی اس دیس میں کیں ظلم کی بات

خریفاں پک جو کملاویں میہوں بِن
کرے تاکید بادل کوں اسی چھِن

چُرا لیوے کدھیں جو دھرت میں نیر
دھرت کوں کھود کاڑے نیر کوں پھیر

جگت تھا باغ ، شہ جوں باغباں تھا
ہمیشہ تازہ اس سوں سب جہاں تھا

دیون ہارا خبر اس نو انبر کا
کَتا ہے بات سورج ہور چندر کا

بلندی سٹ ، سُرج پکڑیا جو پستی
کیا مغرب کے جا معبد میں بستی

مشعل لے چاند کا وَیں بھار آیا
مصلّا جگ پو چندنی کا بچھایا

جو مغرب کی نشانیاں مکھ دکھائے
سو عالم نیند کے سجدے میں آئے

ہُوا حاصل جو راحت کا فراغت
بچھانے پر کیا شہ استراحت

سو دیکھا خواب میں درویش کوں ایک
دُنیا کے عاقبت اندیش کؤں ایک

ہُوا یک بارگی وہ شاہ بیدار
ہُوا سو خواب کی مستی سوں ہُشیار

اگرچہ بھوت کچھ دِستے اہیں خواب
ولے دیکھے ہیں تیوں، کم پائے ہے لاب

فَاَمّا خواب جو دیکھے اہیں رات
کدِھیں سچ بی ہوا ہے بعضے اوقات

معانی واشارات

کتے - کہتے
کدَن - طرف
نانوں - نام
کنچن - سونا (مثنوی میں اس لفظ کا استعمال دوطرح سے کیا گیا ہے (۱) کس-چن (۲) کن-چن)
ٹھار - جگہ
تل - نیچے، تلے
کیں - کہیں
سُکی - سوکھی
کئی - کوئی
کاڑے - نکالے
پھٹنا - نشوونما پانا
پھانٹے - شاخیں
جتا - جتنا
لیوے - لینا
بی - بھی
سُلکھن - اچھے کردار والا
شہاں - شاہ کی جمع
جگ - دنیا
سروراں - سردار
اوسے - اُسے
ہور - اور
ناد - طرح، جیسے
خریفاں پک - خریف کی فصل

کملاویں - کمھلائیں، مرجھائیں
میہوں - بارش
چھن - لمحہ، چھن
کدھیں - کبھی
دھرت - دھرتی، زمین
نیر - پانی
پھیر - پھر، دوبارہ، واپس
جوں - جو
دیون ہارا - دینے والا
نو انبر - نو آسمان
کتا - کہتا
سٹ - جلدی
سُرج - سورج
بستی کرنا - آباد ہونا
پکڑیا - پکڑا
وَیں - وہیں
بھار - باہر
پو - پر
چندنی - چاندنی
دِستے - نظر آتے
بچھانے - بستر
اَہیں - ہیں
ولے - لیکن
لاب - لابھ، فائدہ
فَاَمّا - پس اگر

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ نظم سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

شہر
- نام
- صفت
- سمت
- لوگ

۲۔ دیے گئے الفاظ کی مناسبت سے پٹن شہر کی خوبیوں کو ظاہر کرنے والے مصرعے لکھیے۔

۱۔ ٹھار ←

۲۔ گھراں ←

۳۔ ہوا ←

۴۔ شاہ ←

۵۔ لوگ ←

۳۔ شاہ کی خوبیوں کو ظاہر کرنے والا رواں خاکہ مکمل کیجیے۔

شاہ

کو حاصل تھی ←

کی اطاعت میں تھے ←

کی ضبط میں تھے ←

کے حکم میں تھے ←

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ شاعر نے کنچن پٹن کی جو خوبیاں بیان کی ہیں، انھیں لکھیے۔

۲۔ کنچن پٹن کی آب و ہوا کی تاثیر کو قلم بند کیجیے۔

۳۔ کنچن پٹن کے بادشاہ کی خوبیاں ترتیب وار لکھیے۔

۴۔ مثنوی میں بیان کیا گیا شام کا منظر تحریر کیجیے۔

۵۔ بادشاہ کے خواب کا ذکر قلم بند کیجیے۔

۶۔ رات اور دن کے تغیر کو شاعر نے جس طرح بیان کیا ہے، اُسے وضاحت سے لکھیے۔

۷۔ بادشاہ کو تسلی دینے والے اشعار کا مفہوم لکھیے۔

* اسباب بیان کیجیے۔

۱۔ کنچن پٹن میں فصلوں کا خراب نہ ہونا۔

۲۔ آسمان کے نیچے ایسا نادر شہر کسی آنکھ والے نے نہیں دیکھا تھا۔

* درج ذیل اشعار کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۱۔ چرا لیوے کدھیں جو دھرت میں نیر
دھرت کوں کھود کاڑے نیر کوں پھیر

۲۔ دیون ہارا خبر اس نو انبر کا
کتا ہے بات سورج ہور چندر کا

۳۔ فَـاَمّا خواب جو دیکھے اَہیں رات
کدھیں سچ بی ہوا ہے بعضے اوقات

* درج ذیل موضوعات پر ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

۱۔ مثنوی کے پیش نظر آپ جمہوری حکمرانوں میں جو خوبیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔

۲۔ خواب اور حقیقت

* ہدایات کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ درج ذیل شعر میں برتی گئی صنعت کی شناخت کیجیے۔

جو کُئی باتاں کی سیپیاں کؤں پسارے
کرے مطلب کے پُر موتیاں وو سارے

۲۔ مثنوی سے ان پانچ اشعار کی نشان دہی کیجیے جن میں ردیف استعمال کی گئی ہے۔

۳۔ مثنوی سے تضاد اور مبالغے کے شعر تلاش کر کے لکھیے۔

۴۔ سابقہ 'دار' کا استعمال کر کے اس سے الفاظ بنائیے۔

سرگرمی/منصوبہ :

میر حسنؔ کی مثنوی 'سحر البیان' حاصل کر کے پڑھیے اور اس کے زبان و بیان، واقعات کی ترتیب اور شعری پیشکش پر اپنا تبصرہ تحریر کیجیے۔

۴

دَر مدحِ نواب آصف الدّولہ

میر تقی میرؔ

پیش درس

عام طور پر بادشاہوں اور نوابوں کی تعریف میں کہی جانے والی نظم کو قصیدہ کہتے ہیں۔ آج کل درباروں میں جا کر قصیدے پڑھنے کا رواج نہیں رہا کیونکہ بادشاہ اور نواب ہی نہیں رہے مگر اُردو شاعری میں قصیدہ نگاری کی ایک اہمیت ہمیشہ رہی ہے۔ شاعر قصیدے میں بادشاہ یا نواب کی تعریف خوب بڑھا چڑھا کر کرتا اور صلے میں انعام و اکرام پاتا۔ اُردو شعرا میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ اور مرزا غالبؔ کے قصیدے مشہور ہیں۔ غالبؔ اور ذوقؔ دونوں نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار میں قصیدے پڑھے ہیں۔ بادشاہ کے علاوہ ان کے امیروں یا نوابوں کے محلوں میں عید بقرعید کے موقعوں پر شاعر قصیدے پیش کرتے تھے۔

اُنیسویں صدی میں جب مغل حکومت اپنے خاتمے پر پہنچ رہی تھی، اُردو شاعری میں قصیدے کی روایت زوروں پر تھی۔ دہلی کے دربار کے ساتھ لکھنؤ، حیدرآباد وغیرہ ریاستوں میں بڑے بڑے دربار قائم تھے اور شعرا یہاں پہنچ کر نوابوں کی خدمت میں قصیدے پیش کر کے خوب انعام و اکرام حاصل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ملکی حکومتوں کے بعد انگریز حکومت میں بہت سے شاعر انگریز گورنروں کی خدمت میں قصیدے سنایا کرتے تھے۔

جان پہچان

میرؔ کا پورا نام میر محمد تقی تھا۔ ان کی پیدائش ۱۷۲۳ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں ہوئی۔ ابھی وہ دس گیارہ برس کے تھے کہ اُن کے والد محمد علی (علی متقی) کا انتقال ہوگیا۔ تلاشِ معاش کے لیے میرؔ کو کم عمری ہی میں دہلی آنا پڑا۔ ابتدا میں اپنے سوتیلے ماموں خان آرزوؔ کے یہاں قیام کیا۔ خان آرزوؔ کا شمار اُس وقت کے اہم اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا۔ میرؔ نے اُن سے کافی استفادہ کیا۔

میرؔ نے دہلی کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ نادر شاہ کا حملہ زیادہ تباہ کن ثابت ہوا جس کے نتیجے میں بیشتر اہلِ کمال دہلی چھوڑ کر دوسرے علاقوں کی طرف نکل گئے۔ لکھنؤ میں اُس وقت نواب آصف الدولہ اہلِ فن کی پذیرائی کر رہے تھے۔ اس وجہ سے لکھنؤ صاحبانِ کمال کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ مرزا سوداؔ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ نے سفر خرچ دے کر میرؔ کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ دہلی میں میرؔ کے حالات نہایت خراب تھے۔ چنانچہ میرؔ بھی نواب آصف الدولہ کی دعوت پر ۱۷۸۱ء میں دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ وہ جب تک لکھنؤ دربار میں رہے انھوں نے آصف الدولہ کی مدح میں قصیدے لکھے۔ انھوں نے زندگی کے آخری ایّام لکھنؤ میں گزارے اور وہیں ۲۱؍ستمبر ۱۸۱۰ء کو وفات پائی۔

میرؔ کی زبان سادہ، دلکش اور شگفتہ ہے۔ غزل ان کی پسندیدہ صنفِ سخن تھی مگر غزلوں کے علاوہ انھوں نے قصیدے، مثنویاں، مرثیے، قطعات، رباعیات، مثلث، واسوخت، مخمس، مسدس سبھی اصناف اور اسالیب میں اپنے آثار چھوڑے ہیں اسی لیے اُنھیں 'خدائے سخن' کہا جاتا ہے۔ اُردو کے چھ دیوان کے علاوہ ایک فارسی دیوان بھی ان کی یادگار ہے۔ فارسی نثر میں خودنوشت سوانح 'ذکرِ میر' اور شعرا کا تذکرہ 'نکات الشعرا' بھی اُن کی اہم تصانیف ہیں۔

رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب   آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب
لوٹتا تھا سوزِ غم سے آگ میں   دل جگر سنکتے تھے دونوں جوں کباب
ناگہاں مجھ سے لگا کہنے سروش   رہ گزر سے لطف کی کر کر خطاب
ہے کریم اب بھی وزیر ابنِ وزیر   آصف الدولہ فلک قدر و جناب
آسماں رتبہ ہے جس کا آستاں   ناز کر طالع پہ جو ہو باریاب
اس کی ہمت سے سخن کیا سرکروں   بات کہتے دے دُر و یاقوتِ ناب
اس کے دست و دل کے رشک وشرم سے   خون ہے دل کان کا ، دریا ہے آب
جم حشم ، انجم سپہ ، گردوں شکوہ   مرجعِ خُرد و کلاں ، عالم مآب
دستِ ہمت اس کا گر دُر بار ہو   پانی پانی شرم سے ہووے سحاب
مال کیا ہے ، ہفت گنجِ خسروی   اک ہی کو نوّاب بخشے ہے شتاب
فخر سام و رستم اس کی بندگی   داخلِ خدّام یاں افراسیاب
جس سحر جرأت سے کھینچی اس نے تیغ   ڈھال رکھّے منہ پہ ، نکلا آفتاب
رزم کے عرصے میں ہل چل پڑ گئی   آسماں کے خیمے کی کانپی طناب
خرمن آسا جل گیا انبوہِ خصم   چل پڑی جو اس کی تیغِ برق تاب
دیو تھے گو معرکے میں بے شمار   ایک ٹھہرا ہو مقابل ، کیا حساب
مدعی کی صف ہے کونجوں کی قطار   لشکری اس فوج کا ہر اک عقاب
موجزن جیدھر ہو وہ دریائے فوج   بستیاں اس سمت کی جیسے حباب
گرد اس لشکر کی گر ہووے بلند   پھر زمین و آسماں میں ہے حجاب
داوری و منصفی سُن ، دلبراں   چھوڑ دیں عشّاق پر کرنا عتاب
رفعِ بدعت چاہے تو پھر کیا مجال   اُٹھ سکے جو نغمۂ چنگ و رَباب
منعِ مے ہووے تو پھر قدرت ہی کیا   جو گلے سے شیشے کے اترے شراب
خوبیاں ہی خوبیاں سر تا قدم   تب کیا صانع نے تجھ کو انتخاب
کر دعا پر ، میرؔ ، اب ختمِ سخن   تو کہے جو کچھ کرے حق مستجاب
زیر دست اس کے رہیں گردن کشاں   تا قیامت وہ رہے مالک رقاب

معانی و اشارات

لفظ	معنی
تاب	برداشت
خواب	نیند
سروش	فرشتہ، غیب کی آواز
آسماں رتبہ	آسماں جیسے بلند مرتبے والا
طالع	قسمت
بات کہتے	فوراً
دُر	موتی
جم حشم	جمشید کی سی شان و شوکت والا
انجم سپہ	ستاروں کی فوج رکھنے والا
شکوہ	شان و شوکت
مرجع	جائے پناہ
عالم مآب	دنیا جس کی طرف رجوع کرتی ہے۔
دُربار	موتی برسانے والا
گنجِ خسروی	شاہی خزانہ
شتاب	بلاتوقف، فوراً
سام	ایرانی پہلوان رستم کے دادا کا نام
رزم	جنگ
طناب	خیمے کی رسّی
انبوہِ خصم	دشمنوں کا ہجوم
تیغِ برق تاب	بجلی کو چمکانے والی تلوار مراد بجلی سے زیادہ چمکدار تلوار
کونج	مرغابی
داوری	بادشاہی
رفعِ بدعت	دین میں لائی جانے والی نئی بات کا خاتمہ
چنگ و رَباب	موسیقی کے آلات
مستجاب	قبول کیا گیا
گردن کشاں	باغی، سرکش
رقاب	گردنیں، مراد غلام

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کرکے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

میر تقی میر

پورا نام	تاریخ پیدائش

مقامِ پیدائش	تلاشِ معاش

۲۔ قصیدے سے موزوں لفظ تلاش کرکے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

نواب آصف الدولہ کے لیے صفاتی الفاظ

۳۔

تلمیحی نام

۴۔ اشاروں کے مطابق جدول مکمل کیجیے۔ شعر قصیدے سے منتخب کیجیے۔

صنعت	شعر	تعریف	وضاحت
مبالغہ	....	....	....
تلمیح	....	....	....
تضاد	....	....	....
تشبیہ	....	....	....

٭ ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ سروش نے جو کچھ کہا ہے، اس کا مفہوم وضاحت کے ساتھ لکھیے۔
۲۔ آصف الدولہ کی تیغ کی تعریف قلم بند کیجیے۔
۳۔ آصف الدولہ کے لشکر کی مدح کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کیجیے۔
۴۔ آصف الدولہ کی دادرسی اور منصفی کو بیان کیجیے۔
۵۔ شاعر نے نواب کو جو دعا دی ہے، اسے تحریر کیجیے۔
۶۔ شاعر نے نواب آصف الدولہ کے جو اوصاف بیان کیے ہیں انھیں لکھیے۔
۷۔ نواب آصف الدولہ کی سخاوت بیان کرنے والے اشعار اور اُن کا مفہوم لکھیے۔
۸۔ نواب آصف الدولہ کی جرأت اور بہادری کو متن کے حوالے سے بیان کیجیے۔

٭ اسباب بیان کیجیے۔

۱۔ شاعر کی بے تابی۔
۲۔ شاعر کا نواب آصف الدولہ کا قصیدہ لکھنا۔

٭ درج ذیل اشعار کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۱۔ آسماں رتبہ ہے جس کا آستاں
نازکر طالع پہ جو ہو بارياب
۲۔ دستِ ہمت اس کا گر دُربار ہو
پانی پانی شرم سے ہووے سحاب
۳۔ مدعی کی صف ہے کونجوں کی قطار
لشکری اس فوج کا ہر اک عقاب
۴۔ رفعِ بدعت چاہے تو پھر کیا مجال
اُٹھ سکے جو نغمۂ چنگ و رباب

٭ درج ذیل موضوعات پر ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

درج ذیل شعر کی روشنی میں نواب آصف الدولہ کی شخصیت۔
خوبیاں ہی خوبیاں سر تا قدم
تب کیا صانع نے تجھ کو انتخاب

٭ ہدایات کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ قصیدے سے صنعتِ تلمیح کے اشعار تلاش کرکے لکھیے۔
۲۔ قصیدے سے اس مصرعے کی نشان دہی کیجیے جس میں بادل کا مترادف لفظ استعمال ہوا ہے۔
۳۔ درج ذیل اشعار میں آئی صنعتوں کی نشان دہی کیجیے۔
لوٹتا تھا سوزِ غم سے آگ میں
دل جگر سِنکتے تھے دونوں جوں کباب
گرد اس لشکر کی گر ہووے بلند
پھر زمین و آسماں میں ہے حجاب
۴۔ قصیدے سے مراعاۃ النظیر کے اشعار کی نشان دہی کیجیے۔
۵۔ قصیدے سے تضاد کے اشعار تلاش کرکے لکھیے۔
۶۔ شاعر نے جن اشعار میں بڑھا چڑھا کر بات کی ہے، ان اشعار کی نشان دہی کرکے صنعت کا نام لکھیے۔
۷۔ قصیدے سے ان اشعار کا انتخاب کیجیے جن میں محاوروں کا استعمال ہوا ہے۔

سرگرمی/منصوبہ:

مختلف شعرا کے قصیدوں سے دعائیہ اشعار تلاش کرکے لکھیے۔

۵ تیغِ دو پیکر

میر ضمیؔر

پیشِ درس

اُردو میں صنفِ مرثیہ کو رزمیہ شاعری سے خاص تعلق ہے۔ مرثیہ واقعتہً رزمیہ تو نہیں ہے لیکن رزم کے ذکر کے بغیر یہ مکمل بھی نہیں ہوتا۔ اس تعلق سے میدانِ جنگ میں سپاہیوں کا جمع ہو کر مستعد ہونا، ہتھیاروں کی کھنک، خود و زرہ کی چمک دمک، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، ہاتھیوں کی چنگھاڑیں، ڈھول تاشے کی آوازیں اور پھریروں کی پھڑ پھڑاہٹ میں جنگ کا شور سنائی دیتا ہے۔ دو جنگجوؤں میں رزم آرائی کے وقت خاص طور پر ان کی تلواروں کی تیزی کا بیان مرثیے کا ایک خاص اسلوب ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ سے پہلے میر ضمیؔر نے اس فن کے بیان کو نہایت خوبی سے مرثیے میں پیش کیا ہے۔ دسویں جماعت میں آپ مرثیے کے اجزا اور نویں جماعت میں کربلائی مرثیے اور شخصی مرثیے کے تعلق سے معلومات حاصل کر چکے ہیں۔

جان پہچان

شاعر کا اصل نام میر مظفر حسین اور تخلص ضمیؔر تھا۔ اُن کی تاریخ و مقامِ پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ دس برس کی عمر سے انھوں نے شاعری کا آغاز کیا تھا اور غزل کہنے لگے تھے۔ اس فن میں انھوں نے مصحفیؔ سے استفادہ کیا اور انھوں نے مرثیہ گوئی میں شہرت حاصل کی۔ مرثیے کے علاوہ میر ضمیؔر نے غزلیں، مثنویاں، قصیدے، رباعیاں اور مخمس بھی لکھے ہیں۔ 'نسخۂ محبت' اور 'مظہر العجائب' ان کی اہم مثنویاں ہیں۔ 'چہاردہ بند' ان کے چودہ قصائد کا مجموعہ ہے۔ مرثیہ گوئی کی ابتدا ضمیؔر سے بہت پہلے دکن میں ہو چکی تھی اور لکھنؤ وغیرہ میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہو رہی تھی لیکن ضمیؔر نے مرثیے کو طرزِ نو عطا کیا۔ اسی لیے ضمیؔر کو جدید مرثیے کا بنیاد گزار مانا جاتا ہے۔ ضمیؔر نے خود مرثیے میں سراپا اور جنگ میں صف آرائی کے بیان کو سب سے جدا طرز کہا ہے۔ ان کے مرثیوں کا خاص وصف یہ ہے کہ ان میں بڑی طوالت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں اخلاقیات اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ ہی مقامی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ ۱۸۵۵ء میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔

ذیل کے مرثیے میں ضمیؔر نے حضرت حسینؓ کے صاحب زادے علی اکبر کی بہادری اور شجاعت کا ذکر بڑے خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ اس میں انھوں نے امام حسینؓ کی فوج کی تنظیم کو بیان کر کے واقعہ نگاری کی ایک عمدہ مثال پیش کی ہے۔

اکبر نے جوں ہی میان سے تلوار کو کھینچا   اس تیغ نے میداں میں دِکھایا یہ تماشا
جوں برق تڑپ کر جو گئی تا سرِ اعدا   گہہ سر کو ، گہے ہاتھ کو ، گہہ پاؤں کو کاٹا
ٹکڑے تنِ کفّار کے اک جا پہ نہیں تھے
تھا سر تو کہیں ، ہاتھ کہیں ، پاؤں کہیں تھے

اک جا پہ وہ تلوار نہ دیتی تھی دِکھائی   جوں مرگِ مفاجات ، اِدھر آئی ، اُدھر آئی
ہونے لگی جو لشکرِ اعدا کی صفائی   ہر طائرِ جاں کرنے لگا تن سے جدائی
تھا شور کہ اس تیغ سے عبرت کا محل ہے
تلوار نہیں یہ ، پرِ شہبازِ اجل ہے

اس صف کے سِرے پر جو چلی تیغ دو پیکر — دم تیغِ دو دم نے لیا اس صف کے سِرے پر
پھر دوسری صف پر جو چلی واں سے پلٹ کر — باقی کسی دشمن کے بدن پر نہ رہا سر
گہ طارمِ اعلیٰ پہ ، گہے فرقِ لعیں پر
گہ فرقِ زمیں ، گہ بہ سر گاوِ زمیں پر
شمشیر جو تھی رنگ میں الماس کی تمثال — مرجان کی تھی شاخ کہ بس خوں سے ہوئی لال
تیروں کے لعینوں کے تواتر پہ چلے بھال — مانند زرہ تھیں سپریں ہاتھوں میں غربال
تھی چشمِ زرہ پوش شجاعت کے جو یَل میں
اک دم میں گرفتار ہوئے دامِ اجل میں
وہ تیغ بلندی سے جو آتی سوئے پستی — پستی میں جلا دیتی تھی وہ خرمنِ ہستی
ہستی کی نہ باقی رہی نامردوں کو مستی — مستی انھیں پر خواب اجل کی ہوئی پستی
جس طرح سے گرتی تھی وہ انبوہ کے اوپر
بجلی بھی تڑپ کر نہ گرے کوہ کے اوپر

معانی واشارات

تیغ دو پیکر	-	دونوکوں والی تلوار
اعدا	-	عدو کی جمع، دشمن
گہہ/ گہے	-	گاہ کا مخفف، کبھی
مرگِ مفاجات	-	اتفاقی موت
شہبازِ اجل	-	موت کا پرندہ (فرشتہ)
تیغِ دودم	-	دو دھاری تلوار
طارم	-	گنبد
فرق	-	سر
لعیں	-	بد بخت، دوزخی
غربال	-	چھلنی
تمثال	-	پیکر، صورت
یل	-	پہلوان
مرجان	-	مونگا
خرمنِ ہستی	-	مرادزندگی
انبوہ	-	ہجوم

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

ا۔ پیش درس سے موزوں لفظ تلاش کر کے خاکہ مکمل کیجیے۔

ہتھیاروں کی	خودوزرہ کی	گھوڑوں کی	ہاتھیوں کی	ڈھول تاشے کی	پھریروں کی

۲۔ مرثیے سے موزوں لفظ تلاش کر کے شکلی خاکہ مکمل کیجیے۔

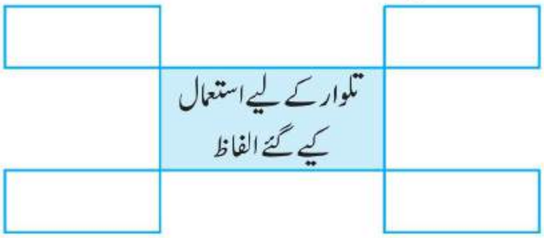

۳۔ تشبیہی الفاظ کی مدد سے شکلی خاکہ مکمل کیجیے۔

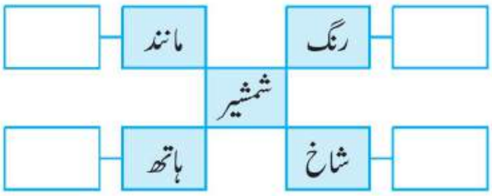

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ یہ مرثیہ جس ہیئت میں لکھا گیا ہے اُسے وضاحت سے بیان کیجیے۔

۲۔ شاعر نے حضرت علی اکبر کی تلوار کی جو تیزی بتائی ہے، اسے لکھیے۔

۳۔ دوسری صف میں تلوار کے چلنے کا اثر بیان کیجیے۔

۴۔ اوپر سے نیچے آتے وقت تیغ جو کچھ کرتی تھی اُسے بیان کیجیے۔

* درج ذیل اشعار کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۱۔ اکبر نے جوں ہی میان سے تلوار کو کھینچا
اس تیغ نے میداں میں دِکھایا یہ تماشا

۲۔ تھا شور کہ اس تیغ سے عبرت کا محل ہے
تلوار نہیں یہ ، پرِ شہبازِ اجل ہے

۳۔ تھی چشم زرہ پوش شجاعت کے جوئل میں
اک دم میں گرفتار ہوئے دامِ اجل میں

* درج ذیل موضوعات پر ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

اس مرثیے سے متعلق۔

* ہدایات کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ مرثیے سے تشبیہ کے اشعار کی نشان دہی کیجیے۔

۲۔ مرثیے سے مبالغے کے اشعار کی نشان دہی کیجیے اور مبالغے کی تعریف لکھیے۔

۳۔ درج ذیل شعر میں برتی گئی صنعتوں کی شناخت کیجیے۔

وہ تیغ بلندی سے جو آتی سوئے پستی
پستی میں جلا دیتی تھی وہ خرمنِ ہستی

۴۔ مرثیے سے صنعتِ تلمیح والے اشعار تلاش کر کے لکھیے۔

۵۔ مرثیے سے زیرِ اضافت کی ترکیبیں تلاش کر کے لکھیے۔

- ....
- ....
- ....
- ....
- ....

سرگرمی/منصوبہ:

۱۔ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور وحید اخترؔ نے بہت سے مرثیے لکھے ہیں۔ اپنی لائبریری یا انٹرنیٹ سے تلاش کر کے ان کا مطالعہ کیجیے۔

۲۔ حالیؔ اور چکبستؔ کے شخصی مرثیے تلاش کر کے پڑھیے اور ان پر تبصراتی نوٹ لکھیے۔

۶ جہان آباد

مرزا محمد رفیع سوداؔ

پیش درس

شہر آشوب ایک موضوعی صنف نظم ہے، جس میں شہر کی بربادی اور شہریوں کی بدحالی کا ذکر ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ قطعوں یا رباعیوں کا مجموعہ ہوتی تھی بعد میں مثنویوں، قصیدوں میں شہر آشوب لکھے جانے لگے اور مسدس، مخمس کی ہیئت کا استعمال کیا جانے لگا۔ شہر آشوب میں شاعر کا رویہ ہمدردانہ ہوتا ہے، اس کے برعکس بعض شعرا تضحیک اور ہجو کا انداز بھی اختیار کرتے ہیں۔

اُردو میں شہر آشوب کا عام رواج محمد شاہ کے زمانے سے ہوا۔ مغلیہ سلطنت کے روبہ زوال ہوتے ہی ابتری کا جو بازار گرم ہوا، اس سے متاثر ہوکر شعرا نے متاثرین کی ہمدردی اور حکام کی ہجو میں ایسی نظمیں لکھیں جو شہر آشوب کی تعریف پر پوری اُترتی ہیں۔ سوداؔ کے اس شہر آشوب میں جہان آباد (دہلی) کی تباہی کا ذکر ہے۔ اُردو کے قدیم شعرا میں ناجیؔ، کمترینؔ، حاتمؔ، لچھمی نرائن شفیقؔ وغیرہ کے یہاں شہر آشوب پر نظمیں ملتی ہیں۔ سوداؔ، میرؔ، نظیرؔ، قائمؔ چاندپوری اور جعفر علی حسرتؔ کے یہاں بھی اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

جان پہچان

سوداؔ کا پورا نام مرزا محمد رفیع تھا۔ ان کے والد شیخ محمد شفیع کابل سے تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ یہیں ۱۷۰۶/۷ء میں سوداؔ کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ سوداؔ کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی معاشی زندگی کا آغاز فوج میں ملازمت سے کیا۔ پھر اسے ترک کر کے مختلف امرا کے درباروں سے وابستگی اختیار کی۔ دہلی کی تباہی کے بعد پہلے فرخ آباد پہنچے پھر فیض آباد آ کر نواب شجاع الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ نواب آصف الدولہ نے جب اپنا دارالسلطنت لکھنؤ منتقل کیا تو سوداؔ بھی ان کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں ۲۶/جون ۱۷۸۱ء کو انتقال ہوا۔

سوداؔ کا اصل میدان قصیدہ ہے لیکن وہ اپنے عہد کے ممتاز غزل گو بھی ہیں۔ قصیدے میں سوداؔ کی قادر الکلامی کا اندازہ ان کے قصیدوں سے لگایا جاسکتا ہے جو مشکل زمینوں میں لکھے گئے ہیں۔ سوداؔ نے صنفِ مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان مثنویات میں بھی مدح اور ہجو کا پہلو غالب ہے۔

کہا میں آج یہ سوداؔ سے کیوں تو ڈانواں ڈول　　　پھرے ہے، جا کہیں نوکر ہو، لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول　　　جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند　　　سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند　　　جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداریِ کول

نہ صرفِ خاص میں آمد نہ خالصہ جاری　　　سپاہی تا متصدّی، سبھوں کو بے کاری
اب آگے دفتر تن کی کہوں میں کیا خواری　　　سوالِ دستخطی پھاڑ کرکے پنساری
کسی کو آنولا دے باندھ اور کسی کو کٹول

امیر اب جو ہیں دانا ، انھوں نے کی ہے یہ چال ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال
بچھی ہے سوزنی ، خوجہ کھڑا جَھلے ہے رومال حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہلِ کمال
دھری ہے سامنے ایک پیکدان اک تنبول

خراب ہیں وہ عمارات ، کیا کہوں تجھ پاس کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس بجائے گل ، چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے ، کہیں پڑے مرغول

یہ باغ ، کھا گئی کس کی نظر ، نہیں معلوم نہ جانے کن نے رکھا یاں قدم ، وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر ، اب اس جگہ ہے زقوم مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کرے ہیں کِلول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

معانی واشارات

ڈانواں ڈول	مراد پریشان حال	کٹول	ایک قسم کی جڑی بوٹی
ٹھٹھول	مذاق، مسخراپن	سوزنی	سوئی کا باریک کام کیا ہوا روئی بھرا کپڑا
ڈھیریوں	ڈھیر لگی ہوئی	حضور	سامنے، حاضری میں
آمد	آمدنی	تنبول	پان
خاوند	مالک	مرغول	جالی دار محراب
فوجداریِ کول	معمولی علاقے کی فوجداری	شوم	منحوس، بدبخت
خالِصہ	سرکار سے ملی ہوئی زمین جس پر کسی دوسرے کا حق نہ ہو	زَقوم	ایک خاردار پودا، تھوہر
		زاغ وزغن	کوّا اور چیل
متصدّی	دیوان، بڑا عہدے دار	کلول	اُچھل کود

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

ا۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

نام	والد کا نام	میر ضمیرؔ	ہندوستان آمد کا مقصد	خاندانی پیشہ

۲۔ نظم سے موزوں لفظ تلاش کر کے خاکہ مکمل کیجیے۔

پیڑوں کے نام

پرندوں کے نام

۳۔ نظم کے مصرعوں کے حوالے سے خاکے میں موزوں جملہ/فقرہ لکھ کر خاکہ مکمل کیجیے۔

سپاہی ←

امیر دانا ←

خوجہ ←

ندیم ←

*** ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔**

۱۔ دوسرے بند میں بیان کیا گیا دولت مندوں کی بربادی کا حال لکھیے۔

۲۔ جن چیزوں کو دیکھ کر شاعر زندگی سے اُداس ہے، ان کی معلومات دیجیے۔

۳۔ شاعر نے نظم میں شہر کی بدحالی کا جو نقشہ کھینچا ہے، اسے لکھیے۔

*** درج ذیل اشعار کی استحسانی وضاحت کیجیے۔**

۱۔ نہ صرفِ خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا متصدّی ، سبھوں کو بے کاری
اب آگے دفتر تن کی کہوں میں کیا خواری
سوالِ دستخطی پھاڑ کر کے پنساری
کس کو آنولا دے باندھ اور کسی کو کٹول

۲۔ جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خُلق موتی رول

*** درج ذیل موضوعات پر ذاتی رائے تحریر کیجیے۔**

☆ آخری بند کی روشنی میں جہان آباد اور ملک کے موجودہ حالات۔

*** ہدایات کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔**

سابقہ 'دان' کا استعمال کر کے اس سے الفاظ بنائیے۔

سرگرمی/منصوبہ :

۱۔ اپنے علاقے میں ناگہانی حادثے کے بعد رونما ہونے والے حالات کی منظرکشی کیجیے۔

۲۔ نظیر اکبرآبادی نے آگرے کا شہر آشوب لکھا ہے، اسے تلاش کر کے پڑھیے اور اس نظم سے اس کا موازنہ کیجیے۔

۷ زندگی سے ڈرتے ہو

ن. م. راشدؔ

پیش درس

جوشؔ اور اقبالؔ کے بعد اُردو شاعری بہت سی روایتوں سے آزاد ہوگئی۔ اس زمانے میں قصیدے، مثنوی وغیرہ اصناف کا چلن کم ہوکر ختم سا ہوگیا تھا اور مغربی اصنافِ شعر کی تقلید میں اُردو شعرا آزاد اور معریٰ نظم کی ہیئتیں اختیار کرنے لگے تھے۔ نظم کی ہیئتوں کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں بھی بہت تبدیلیاں آئیں۔ دو عالمی جنگوں کے اثرات دنیا بھر کے ممالک پر پڑے اور ان کے بعد یورپ اور امریکہ میں ظہور پانے والے فلسفیانہ نظریات نے مشرقی ملکوں کو بھی متاثر کیا جس کے نتیجے میں اشتراکی، وجودی اور جمالیاتی نظریات عام ہونے لگے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے آغاز کے کچھ برسوں کے بعد اس سے وابستہ بہت سے فنکاروں نے الگ راہ اپنائی جو شعر و ادب پر بیرونی سیاسی افکار کے جبر کو قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ گروہ حلقہ اربابِ ذوق کہلایا۔ اس میں ن.م. راشدؔ، میراجیؔ، اخترؔ الایمان، محمد دین تاثیرؔ، ضیاؔ جالندھری وغیرہ اہم فنکار شامل تھے۔ ان شعرا نے آزاد نظم کو خوب ترقی دی اور اسے اپنے زمانے میں نظم کی مقبول ہیئت بنا دیا۔ آزاد نظم میں شاعری کی روایتی زبان سے بھی اختلاف کیا گیا۔ نئے استعارے، نئی تشبیہیں اور خاص طور پر شعری پیکر اور علامتیں آزاد نظم میں نئی زبان کے طور پر سامنے آئیں۔ راشدؔ کی درج ذیل نظم بھی اسی طرز کی حامل ہے۔ اس میں رشتہ ہائے آہن، نارسائی کا دَور، بے ریا خدائی، شبِ زباں بندی، نور کی زباں، دیو کا سایہ وغیرہ ایسے ہی نئے استعارے اور علامات ہیں۔

اس نظم میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ انسان اس کائنات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے اپنی ذمے داریوں کو سمجھنا چاہیے اور مصائب اور مشکلات سے مقابلہ کرتے ہوئے زندگی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے رہنا چاہیے۔ زندگی ایک مستقل امکان کا نام ہے۔

جان پہچان

ن.م. راشد کا نام نذر محمد راشد تھا۔ ادبی دنیا میں انھیں ن.م. راشدؔ کے نام سے شہرت ملی۔ ان کی پیدائش یکم اگست ۱۹۱۰ء کو پنجاب میں ہوئی۔ وہ کئی رسالوں کے مدیر رہے۔ انھیں ترجمہ نگاری سے خاص شغف تھا۔ انھوں نے کچھ عرصہ فوج میں بھی ملازمت کی۔ اس سلسلے میں ان کا قیام ایران اور بعض دوسرے ملکوں میں رہا۔ ان کا انتقال ۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء کو برطانیہ میں ہوا۔

ن.م. راشدؔ نے نظم کی ہیئت میں کئی تجربے کیے اور آزاد نظم کو فروغ دیا۔ وہ اپنی شاعری میں ایک دانشور کے طور پر نمایاں ہوئے۔ ان کی نظموں میں تہ داری پائی جاتی ہے۔

راشدؔ نے اپنی نظموں میں ایرانی تلمیحات کے علاوہ ہندوستانی اساطیر سے بھی کام لیا ہے۔ انھوں نے علامتی زبان میں سامراجی طاقتوں کی استحصالی سازشوں کو بے نقاب کیا۔

مشرق پر مغرب کی بالادستی اور مغرب کے ہاتھوں مشرق کے سیاسی استحصال کے خلاف راشدؔ نے کھل کر آواز بلند کی۔ اپنی عملی زندگی کے آغاز میں راشدؔ کچھ دنوں تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے۔ زندگی کا خاصا بڑا حصہ ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے ایران میں اور پھر یو.این.او. (امریکہ) میں گزارا۔ ان کا پہلا مجموعہ 'ماورا' اُردو شاعری میں ایک نئے طرزِ احساس اور اظہار کا ترجمان ہے۔ 'ماورا' کے بعد راشدؔ کے دوسرے شعری مجموعے شائع ہوئے: 'ایران میں اجنبی، لا=انسان' اور 'گمان کا ممکن'۔ ان کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔

زندگی سے ڈرتے ہو
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں

آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے، آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے
'اَن کہی' سے ڈرتے ہو
جو ابھی نہیں آئی، اُس گھڑی سے ڈرتے ہو
اُس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو

پہلے بھی تو گزرے ہیں
دورِ نارسائی کے 'بے ریا' خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو، ہیچ آرزومندی
یہ شبِ زباں بندی، ہے رہِ خداوندی
تم مگر یہ کیا جانو
لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں، راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو
روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں
روشنی سے ڈرتے ہو

شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر، خاک ہو گیا آخر
ازدحامِ انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہِ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو
ہاں ابھی تو تم بھی ہو، ہاں ابھی تو ہم بھی ہیں
تم ابھی سے ڈرتے ہو

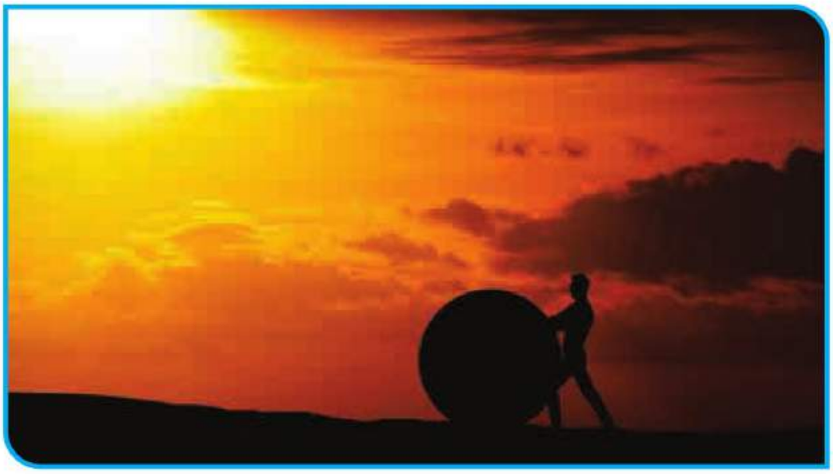

معانی و اشارات

رشتہ ہائے آہن - آہنی رشتے، مضبوط تعلق
نارسائی - نہ پہنچ پانا، ناکامی
ہیچ - معمولی

آرزومندی - آرزو رکھنا
زباں بندی - اظہار کی پابندی
رہِ خداوندی - مراد آقاؤں کا طریقہ

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

ا۔ پیش درس سے موزوں لفظ لکھ کر شکلی خاکہ مکمل کیجیے۔

حلقۂ اربابِ ذوق

۲۔ جان پہچان سے موزوں لفظ لکھ کر شکلی خاکہ مکمل کیجیے۔

ن.م. راشد کے شعری مجموعے

۳۔ نظم سے موزوں لفظ تلاش کر کے شکلی خاکہ مکمل کیجیے۔

ڈرتے ہو

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

ا۔ آدمی کو ڈرانے والی چیزوں کے بارے میں وضاحت سے لکھیے۔

۲۔ گزرے ہوئے دور کے بارے میں شاعر کے خیالات قلم بند کیجیے۔

۳۔ نظم کی روشنی میں آدمی کے متعلق شاعر کے خیالات لکھیے۔

* درج ذیل کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

ا۔ آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ

۲۔ یہ شب زباں بندی، ہے رہِ خداوندی

* درج ذیل موضوع پر ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو

* ہدایات کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

ا۔ اس نظم کی ہیئت کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ درج ذیل ترکیبوں کی وضاحت کیجیے۔

رشتہ ہائے آہن ، بے ریا خدائی ، راہرو کا خون

۳۔ اس نظم سے چند ہم قافیہ الفاظ جمع کیجیے۔

۴۔ اس نظم سے چند ایسے مصرعے جمع کیجیے جن میں ردیفوں کا استعمال ہوا ہو۔

سرگرمی/منصوبہ :

پابند نظم اور آزاد نظم کے بارے میں اپنے استاد سے معلومات حاصل کر کے لکھیے۔

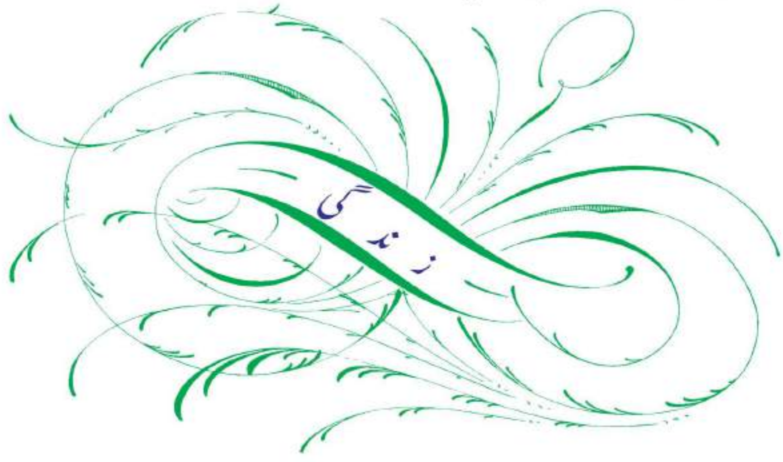

۸ رباعیات

میر انیسؔ

پیشِ درس

رباعی بحرِ ہزج کے ایک خاص وزن میں لکھی جانے والی چار مصرعوں پر مشتمل مختصر نظم ہے۔ چار مصرعوں میں تین مصرعے (پہلا، دوسرا اور چوتھا) ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ کبھی چاروں مصرعوں میں بھی قافیہ استعمال کرلیا جاتا ہے۔ اس صنف کی ہیئت میں ایسی پابندی لازمی نہیں جیسے غزل کسی بھی وزن و بحر میں کہہ سکتے ہیں لیکن رباعی اپنی روایت کے مطابق صرف ایک مخصوص وزن کی پابند ہے اور سیکڑوں برس سے پابند رہی ہے۔ کچھ ایرانی شاعروں اور خود علامہ اقبالؔ نے اس وزن کو بدل کر رباعیاں کہی ہیں جنھیں 'ترانہ' کہا جاتا ہے لیکن ترانے کا چلن نہیں کے برابر ہے۔

جان پہچان

میر انیسؔ کا نام میر ببر علی تھا۔ وہ ۱۸۰۲/۳ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ میر حسنؔ کے پوتے تھے۔ میر انیسؔ کے والد میر مستحسن خلیقؔ بھی ایک باکمال شاعر تھے۔

میر انیسؔ نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی لیکن جلد ہی مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہوگئے۔ ان کے مرثیے فصاحت وبلاغت کی عمدہ مثال ہیں۔ میر انیس کو منظر نگاری، کردار نگاری اور رزم نگاری میں کمال حاصل تھا۔ وہ واقعات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ نادر تشبیہیں، دلکش استعارے اور آسان زبان ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ انیسؔ کا انتقال ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۴ء کو لکھنؤ میں ہوا۔

مرثیہ نگار کے ساتھ انیسؔ نے رباعی گو کی حیثیت سے بھی اپنا مقام بنایا ہے۔ ان کی رباعیوں میں عام طور سے عشقِ حقیقی، اللہ کی وحدانیت، دنیا کی بے ثباتی، فکرِ آخرت اور اخلاقی قدروں کے مضامین بیان کیے گئے ہیں۔

کیا سوچ کے اس دارِ فنا میں آئے — آفت میں پھنسے، دامِ بلا میں آئے
اس طرح عدم سے آئے دنیا میں، انیسؔ — جیسے کوئی کارواں سَرا میں آئے

اندیشۂ باطل سحر و شام کیا — عقبیٰ کا نہ ہائے، کچھ سر انجام کیا
ناکام چلے جہاں سے، افسوس انیسؔ — کس کام کو یاں آئے تھے، کیا کام کیا

جب اُٹھ گیا سایۂ جوانی سر سے — پھر ہوگی جدا نہ سرگرانی سر سے
کچھ ہوگا نہ ہاتھ پاؤں مارے سے، انیسؔ — جس وقت گزر جائے گا پانی سر سے

کیوں زر کی ہوس میں آبرو دیتا ہے — ناداں یہ کسے فریب تو دیتا ہے
لازم نہیں اپنے منہ سے تعریف، انیسؔ — خالص ہے جو مشک، آپ بُو دیتا ہے

آزادی میں آفتِ اسیری آئی شاہی نہ ہوئی تھی کہ فقیری آئی
ایامِ شباب کس کو کہتے ہیں، انیسؔ موسم طفلی کا تھا ، پیری آئی

دو دن کی حیات پر عبث غرّہ ہے خورشید نہ بن ، خاک کا تو ذرّہ ہے
مردم کے نہالِ زندگانی کے لیے یہ آمد و شد دَم کی نہیں ، ارّہ ہے

معانی واشارات

سرانجام کرنا – انتظام/اہتمام کرنا	نہالِ زندگانی – مراد زندگی کا درخت
سرگرانی – پریشانی	آمد وشد – آنا جانا
غرّہ – غرور	دَم – سانس
مردُم – انسان	ارّہ – آری

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

میر انیسؔ

نام	مقام پیدائش

والد	دادا

۲۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

میر انیسؔ کی رباعیوں کے مضامین

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

رباعی – ۱

پہلی رباعی میں شاعر جو بات کہنا چاہتا ہے، اسے لکھیے۔

رباعی – ۲

دوسری رباعی کے اس شعر میں برتی گئی صنعت کی شناخت کیجیے۔

اندیشۂ باطل سحر و شام کیا
عقبیٰ کا نہ ہائے، کچھ سر انجام کیا

رباعی – ۳

تیسری رباعی میں ہاتھ پاؤں مارنا اور پانی سر سے اونچا ہونا کے معنی لکھیے اور محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

رباعی – ۴

چوتھی رباعی کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

رباعی – ۵

پانچویں رباعی میں برتی گئی صنعت کی نشان دہی کیجیے۔

رباعی – ۶

چھٹی رباعی کے دوسرے شعر کا مفہوم واضح کیجیے۔

۹ قطعات

محمد ابراہیم ذوقؔ

پیشِ درس

غزل یا قصیدے میں جب کوئی شاعرانہ خیال دو یا دو سے زیادہ شعروں میں مسلسل ادا کیا جاتا ہے تو ایسے شعروں کے مجموعے کو قطعہ کہتے ہیں۔ 'قطعہ' کے لفظی معنی 'ٹکڑا' کے ہیں۔ اس کی جمع قطعات ہے۔ قطعہ عموماً چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتا ہے۔ قطعہ میں دو سے زیادہ اشعار بھی ہو سکتے ہیں مگر اس کی تعداد متعین نہیں ہے۔ اگر یہ غزل یا قصیدے ہی میں ہوں تو انھیں قطعہ بند اشعار بھی کہا جاتا ہے۔ آج کل غزل یا قصیدے میں ایسے مسلسل اشعار نظم نہیں کیے جاتے۔

اُردو شاعری میں قطعہ بہت مقبول رہا ہے۔ بعض شاعروں کے قطعات بہت مشہور ہوئے ہیں۔ جیسے حالؔی، اکبؔر، اقبالؔ، جوشؔ، اخترؔ انصاری، نریش کمار شاؔد وغیرہ۔ آج کل مشاعروں میں زیادہ تر شعرا اپنا کلام سنانے سے پہلے دو چار قطعات ضرور سناتے ہیں۔ اس سے قطعے کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذوقؔ نے بھی قصائد اور غزلیات کے علاوہ قطعات لکھنے میں طبع آزمائی کی ہے۔

جان پہچان

مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفؔر کے استاد محمد ابراہیم ذوقؔ ۲۲؍اگست ۱۷۹۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھیں بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ قلعۂ معلّٰی سے وابستہ ہونے کے بعد دہلی کے علمی و ادبی حلقوں میں ذوقؔ کا مقام و مرتبہ بلند ہو گیا۔ اکبر شاہ ثانی نے انھیں 'ملک الشعرا' کا خطاب عطا کیا۔ انھیں 'خاقانیِ ہند' بھی کہتے ہیں۔ وہ مشہور تو قصیدہ گو کی حیثیت سے تھے مگر غزل، قطعہ اور دیگر اصناف میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ ۱۶؍نومبر ۱۸۵۴ء کو ذوق کا انتقال دہلی میں ہوا۔

دنیا سے ذوقؔ رشتۂ اُلفت کو توڑ دے — جس سر کا ہے یہ بال اسی سر میں جوڑ دے
پر ذوقؔ تو نہ چھوڑے گا اس پیر زال کو — یہ پیر زال گر تجھے چاہے تو چھوڑ دے

جانے کب بے درد اندازِ کلامِ دردمند — ذوقؔ، میرا ہم سخن گر ہو کوئی دل خستہ ہو
منہ سے جو نکلے وہ کچھ ہو، پر ہو دلکش ایک بات — آہِ موزوں ہو کہ نالہ مصرعِ برجستہ ہو

قدم سنبھال کے رکھ راہِ عشق میں، اے ذوقؔ — گزرنا اس رہِ دشوار سے نہ آساں ہے
جو کوئی آبلۂ پائے مور بھی ہے یہاں — ترے ڈبونے کو وہ بھی تنورِ طوفاں ہے

دیکھتے ہیں جلوۂ گل ہائے رنگا رنگ ہم — مثلِ نرگس اس چمن میں جب تلک ہے چشم وا
آخرش ہوگا وہی اک دن خزاں کے ہاتھ سے — جو کہ عالم اپنا اس نشو و نما سے پہلے تھا
ہے غنیمت کوئی دم نظارۂ رنگِ بہار — پھر کہاں یہ گلشن و گل اور یہ سبزہ، ہوا

معانی واشارات

پیرزال	-	بوڑھی عورت مراد دنیا
آبلۂ پائے مور	-	چیونٹی کے پاؤں کا چھالا
تنورطوفاں	-	وہ تنور جس سے حضرت نوحؑ کا سیلاب جاری ہوا تھا۔
جلوۂ گلہائے رنگارنگ	-	طرح طرح کے رنگوں کے پھولوں کا جلوہ
کوئی دم	-	کچھ وقت کے لیے
نظارۂ رنگِ بہار	-	بہار کے رنگوں کا نظارہ

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

ا۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

نام		مقام پیدائش
	ذوقؔ دہلوی	
تاریخ پیدائش		خطاب

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

قطعہ-۱

ا۔ قطعے کے موضوع کو واضح کیجیے۔

۲۔ پیرزال کے مفہوم کی وضاحت کیجیے۔

قطعہ - ۲

ا۔ شاعر کی خواہش بیان کیجیے۔

۲۔ شاعر کے ہم سخن ہونے کی شرط تحریر کیجیے۔

قطعہ - ۳

ا۔ 'راہِ عشق' کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۲۔ قطعے کی صنعتِ تضاد کو واضح کیجیے۔

قطعہ - ۴

ا۔ شاعر کو جس بات کا یقین ہے، اسے تحریر کیجیے۔

۲۔ چمن کا انجام اور اُس سے شاعر کا تعلق واضح کیجیے۔

۱۰ غزلیات

پیش درس

اُردو کے شعری سرمایے کا بڑا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزل گو شعرا کو ہر زمانے میں مقبولیت حاصل رہی ہے۔ نقادوں نے اسے اُردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ دکن کے ابتدائی دور سے آج تک تمام قابلِ ذکر شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

غزل نے عربی قصیدے کے ایک جزو 'تشبیب' سے علیحدہ ہو کر ایک مستقل صنف کی صورت اختیار کی۔ فارسی شعرا کا غیر معمولی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عربی قصیدے میں رائج مسلسل اشعار کہنے کے سلسلے کو بدل کر غزل کے ہر شعر کو ایک علیحدہ مضمون کے لیے مخصوص کر دیا۔ نظم کے اشعار معنوی سطح پر ایک دوسرے سے مربوط ہوا کرتے ہیں۔ جبکہ غزل کے ہر شعر میں ایک نیا مضمون پایا جاتا ہے۔

غزل کی تاریخ کئی نشیب و فراز سے گزری ہے۔ اُردو میں سلطان محمد قلی قطب شاہ پہلا صاحبِ دیوان غزل گو شاعر ہے جس کے کلام میں فارسی اور دکنی کا امتزاج ملتا ہے۔ اس کے بعد نشاطی، غواصی، وجہی اور بہت سے شعرا سے گزر کر غزل شمالی ہند پہنچی۔ دکنی دور میں غزل کی شستہ شکل ولی کے یہاں ملتی ہے۔ ان کی استادی کا آج بھی اعتراف کیا جاتا ہے۔

شمالی ہند میں غزل کے اوّلین شعرا میں شاہ مبارک، آبرو، ناجی اور حاتم قابلِ ذکر ہیں۔ میر اور سودا کا عہد اُردو غزل کا دَورِ زرین کہلاتا ہے۔ اس کے بعد کے شعرا میں مصحفی، ناسخ، آتش، غالب، مومن، ذوق، درد، داغ اور امیر مینائی کی غزلوں میں دہلوی اور لکھنوی تہذیب کے رنگ نمایاں ہیں۔ غزل کے دیگر شعرا میں حسرت، جگر، فانی، اصغر، اقبال، فراق، مجاز، فیض، مجروح، روش صدیقی، ندا فاضلی وغیرہ نام اہمیت کے حامل ہیں۔

موجودہ عہد کے غزل گو شعرا کی تخلیقی سمت و رفتار پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کے یہاں مختلف روایتوں کے واضح نشانات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی غزل میں کلاسیکیت سے گریز، ترقی پسندی اور جدیدیت جیسے مختلف عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے اس میں عاشقانہ اور صوفیانہ رنگ کے علاوہ عصرِ حاضر کے مسائل میں اُلجھے ہوئے انسان کے جذبات و احساسات کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔

غزل ۱ - خواجہ حیدر علی آتشؔ

جان پہچان

آتشؔ کا پورا نام خواجہ حیدر علی تھا۔ وہ ۱۷۷۸ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ کم سنی ہی میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ وہ نواب محمد تقی خاں ہوسؔ کے یہاں ملازم ہو گئے۔ انھی کے ہمراہ فیض آباد سے وہ لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ میں انھوں نے مصحفیؔ کی شاگردی اختیار کی لیکن کسی بات پر خفا ہو کر رشتہ توڑ لیا۔ آتشؔ کا انتقال ۱۳؍ جنوری ۱۸۴۷ء کو لکھنؤ میں ہوا۔

آتشؔ کے مزاج میں قناعت تھی۔ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دربار سرکار سے ربط ضبط انھیں پسند نہ تھا۔ ان کی شاعری میں لکھنوی طرز نمایاں ہے۔ انھوں نے شعری صنعتوں سے خوب کام لیا ہے اور جذبات و احساسات کو بھی بڑے سلیقے سے نبھایا ہے۔ ان کے یہاں اخلاقی مضامین اور تصوف کے مسائل کے ساتھ ساتھ بلند خیالی اور حسنِ بیان بھی ہے۔

ادب تا چند، اے دستِ ہوس، قاتل کے دامن کا
سنبھل سکتا نہیں اب دوش سے بوجھ اپنی گردن کا

بہار اک دل کے داغوں نے دکھائی چشمِ قاتل کو
دہانِ زخمِ سینہ بن گیا دروازہ گلشن کا

کڑا پن آگے مردانِ خدا کے چل نہیں سکتا
کفِ داؤد میں یکساں ہے عالم موم و آہن کا

درِ فردوس پر رضواں سے رخصت کون لیتا ہے
سمجھتا ہوں میں کھیل اک ، پھاندنا دیوارِ گلشن کا

ہوئی ہے مردمِ دنیا کی صورت سے یہ بیزاری
گماں ہوتا ہے اپنے سایے پر بھی ہم کو دشمن کا

ستایا ہے نہایت انقلابِ دہر نے ہم کو
رہا کرتا ہے چشمِ تر کے اوپر گوشہ دامن کا

کیا اک آن میں تیغِ قضا نے صاف دو ٹکڑے
گماں ہی رہ گیا دشمن کو آتشؔ ، اپنے جوشن کا

معانی واشارات

تا چند	کب تک
دوش	کندھا، شانہ
کف	ہتھیلی
رضواں	جنت کا دربان فرشتہ
انقلابِ دہر	زمانے کی تبدیلی
جوشن	تلوار کی ضرب سے حفاظت کے لیے کہنی تک آہنی لباس

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

نام		سنۂ پیدائش
	آتش	
مقامِ پیدائش		سنۂ وفات

۲۔ غزل میں آئے زیرِ اضافت کے الفاظ کا شبکی خاکہ ترتیب دیجیے۔

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ سینے کے زخم پر دل کے داغوں کی بہار کا اثر بیان کیجیے۔

۲۔ شاعر جس کھیل کو آسان سمجھتا ہے، اس کی نشان دہی کیجیے۔

۳۔ 'انقلابِ دہر نے ہم کو ستایا ہے' اس بات سے شاعر کی مراد لکھیے۔

* اسباب بیان کیجیے۔

۱۔ شاعر کی دنیا سے بیزاری۔

۲۔ 'رہا کرتا ہے چشمِ تر کے اوپر گوشہ دامن کا'

* درج ذیل اشعار کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۱۔ کڑاپن آگے مردانِ خدا کے چل نہیں سکتا
کفِ داؤد میں یکساں ہے عالم موم و آہن کا

۲۔ درِ فردوس پر رضواں سے رخصت کون لیتا ہے
سمجھتا ہوں میں کھیل اک پھاندنا دیوارِ گلشن کا

۳۔ کیا اک آن میں تیغِ قضا نے صاف دو ٹکڑے
گماں ہی رہ گیا دشمن کو آتش اپنے جوشن کا

* درج ذیل موضوعات پر ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

۱۔ گمان۔

۲۔ غزل سے اپنی پسند کے شعر کی وجہ۔

* ہدایات کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ غزل کے مطلع میں برتی گئی صنعت کا نام لکھیے۔

۲۔ غزل سے صنعتِ تضاد کا شعر تلاش کیجیے۔

۳۔ غزل سے صنعتِ تلمیح والے اشعار کی نشان دہی کر کے ان کی تشریح کیجیے۔

سرگرمی/منصوبہ :

کلیاتِ آتش حاصل کر کے اُس میں سے اپنی پسند کی پانچ غزلیں لکھیے۔

غزل ۲ : نواب مرزا داغؔ دہلوی

جان پہچان

داغؔ دہلوی کا نام نواب مرزا تھا۔ وہ ۲۵ر مئی ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھے سات سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے بیٹے مرزا فخرو نے داغؔ کی والدہ کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ چنانچہ ماں کے ساتھ وہ بھی لال قلعے میں رہنے لگے۔ یہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ لال قلعے کی شاعرانہ فضا میں شاعری شروع کی اور ذوقؔ کے شاگرد ہوئے۔ استاد کے فیضِ تربیت اور اپنی مشقِ سخن سے تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے استادی کا درجہ حاصل کر لیا۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا اس لیے داغؔ کو اپنی والدہ کے ساتھ قلعہ چھوڑنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انھوں نے دہلی کو خیرباد کہا اور رام پور چلے گئے۔ والیٔ رام پور نواب یوسف علی خاں نے داغؔ کی بڑی قدر و منزلت کی اور انھیں ولی عہد کلب علی خاں کا مصاحبِ خاص مقرر کر دیا۔ کلب علی خاں کے انتقال کے بعد داغؔ حیدرآباد چلے گئے۔ وہاں بھی اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نظام حیدرآباد میر محبوب علی نے انھیں اپنی استادی کا شرف بخشا۔ بڑی تنخواہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً انعامات سے بھی نوازے گئے۔ حیدرآباد ہی میں ۱۷ر مارچ ۱۹۰۵ء کو وفات پائی۔

داغؔ کی تصانیف میں چار دیوان 'گلزارِ داغ'، 'آفتابِ داغ'، 'ماہتابِ داغ' اور 'یادگارِ داغ'، ایک مثنوی 'فریادِ داغ' اور ان کے علاوہ چند قصائد اور رباعیات شامل ہیں۔ دہلی کی تباہی پر ان کا شہر آشوب بھی مشہور ہے۔

داغؔ کی شاعری کی ممتاز خصوصیت زبان کا استعمال ہے۔ سادگی و شیرینی، ترنّم و روانی ان کی زبان کی بنیادی صفات ہیں۔ انھوں نے محاورات کا استعمال نہایت برجستہ انداز میں کیا ہے۔ شوخی و بانکپن اور رنگیں بیانی داغؔ کی شاعری کا حصہ ہیں۔ کلام کی سادگی، صفائی، روانی اور عام پسند جذبات و خیالات کی ترجمانی کی بدولت داغؔ اپنے زمانے کے مقبول شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا اثر معاصرین نیز بعد کے بہت سے شعرا پر بھی پڑا اور ایک خاص مدت تک اُن کے رنگِ کلام کی تقلید ہوتی رہی۔

میرا جدا مزاج ہے ، اُن کا جدا مزاج
پھر کس طرح سے ایک ہو اچھا برا مزاج

دیکھا نہ اس قدر کسی معشوق کا غرور
اللہ کیا دماغ ہے ، اللہ کیا مزاج

کس طرح دل کا حال کُھلے اس مزاج سے
پوچھوں مزاج تو وہ کہیں ، آپ کا مزاج

تم کیا کسی کے دل میں بھلا گھر بناؤ گے
بنتا نہیں بنائے سے بگڑا ہوا مزاج

تم کو ذرا سی بات کی برداشت ہی نہیں
ایسا اکھل کُھرا بھی ہے کس کام کا مزاج

پالا پڑے کہیں نہ کسی بدمزاج سے
ہر وقت دیکھتے ہیں مزاج آشنا مزاج

کل اُن کا سامنا جو ہوا ، خیر ہوگئی
بدلی ہوئی نگاہ تھی ، بدلا ہوا مزاج
سچ ہے ، خدا کی دین میں کیا دخل ہوسکے
اک داغؔ کا مزاج ہے ، اک آپ کا مزاج

معانی واشارات

اکھل کھرا - اکھڑ مزاج، سخت مزاج

طبع - طبیعت، فطرت، مزاج

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کرکے شکلی خاکہ مکمل کیجیے۔

نام		مقام پیدائش
	نواب مرزا داغؔ دہلوی	
تاریخ پیدائش		وفات

۲۔ غزل سے موزوں لفظ تلاش کرکے شکلی خاکہ مکمل کیجیے۔

	مزاج	

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ بگڑے ہوئے مزاج سے پیدا ہونے والی خرابی بیان کیجیے۔
۲۔ اکھل کھرا مزاج کے لوگوں کی صفات لکھیے ۔
۳۔ مقطع میں پیش کیے گئے شاعر کے خیال کی وضاحت کیجیے۔

* درج ذیل اشعار کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۱۔ کس طرح دل کا حال کھلے اس مزاج سے
پوچھوں مزاج تو وہ کہیں ، آپ کا مزاج
۲۔ تم کیا کسی کے دل میں بھلا گھر بناؤ گے
بنتا نہیں بنائے سے بگڑا ہوا مزاج
۳۔ پالا پڑے کہیں نہ کسی بدمزاج سے
ہر وقت دیکھتے ہیں مزاج آشنا مزاج
۴۔ سچ ہے ، خدا کی دین میں کیا دخل ہوسکے
اک داغؔ کا مزاج ہے، اک آپ کا مزاج

* درج ذیل موضوعات پر ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

۱۔ اچھے برے مزاج کے بارے میں۔
۲۔ اکھل کھرے لوگوں کے بارے میں۔
۳۔ ہم مزاج لوگوں کے بارے میں۔

* ہدایات کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ غزل سے صنعتِ تضاد کا شعر تلاش کیجیے۔
۲۔ غزل کے قافیوں کی نشاندہی کرکے لکھیے ۔
۳۔ درج ذیل محاوروں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔
نگاہ بدلنا ، دل میں گھر بنانا۔

غزل ۳ : جگؔر مرادآبادی

جان پہچان

جگؔر مرادآبادی کا نام علی سکندر تھا۔ وہ ۶ / اپریل ۱۸۹۰ء کو مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ جگؔر کے والد مولوی علی نظؔر بھی شاعر تھے۔ جگر کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ شروع میں انھوں نے اپنے والد سے اصلاح لی پھر داغؔ کے شاگرد ہوئے۔ منشی امیر اللہ تسلیمؔ اور اصغؔر گونڈوی سے بھی مشورۂ سخن کیا۔ جگؔر کی شاعری میں عشقِ مجازی نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں والہانہ پن اور سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اصغؔر گونڈوی کے زیرِ اثر وہ تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ 'داغِ جگر'، 'شعلۂ طور' اور 'آتشِ گل' اُن کے شعری مجموعے ہیں۔ انھیں 'آتشِ گل' پر ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈی. لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی تھی۔ ۹ / ستمبر ۱۹۶۰ء کو ان کا انتقال گونڈا میں ہوا۔

مقاماتِ اربابِ جاں اور بھی ہیں — مکاں اور بھی لامکاں اور بھی ہیں
مکمل نہیں ہے جنونِ تجسّس — مسلسل جہاں در جہاں اور بھی ہیں
یہیں تک نہیں عشق کی سیرگاہیں — مہ و انجم و کہکشاں اور بھی ہیں
قفس توڑ کر مطمئن ہو نہ بلبل — قفس صورتِ آشیاں اور بھی ہیں
بہت دل کے حالات کہنے کے قابل — ورائے نگاہ و زباں اور بھی ہیں
صبا خاکِ دل سے بچا اپنا دامن — ابھی اس میں چنگاریاں اور بھی ہیں

انھیں جب سے ہے اعتمادِ محبت
وہ مجھ سے جگؔر، بدگماں اور بھی ہیں

معانی و اشارات

اربابِ جاں – جان کے مالک، مراد انسان

لامکاں – مراد آخرت

ورائے نگاہ و زباں – نگاہوں اور زبان سے ظاہر ہونے والی باتوں سے پرے

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

جگؔر مراد آبادی

نام	
تاریخ پیدائش	
مقام پیدائش	
وفات	

۲۔ رواں خاکہ مکمل کیجیے۔

قافیہ	
ردیف	
مطلع	
مقطع	

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ مہ و انجم و کہکشاں کے بارے میں شاعر کا خیال بیان کیجیے۔

۲۔ دل کے بہت سے ناقابلِ بیان حالات کے متعلق شاعر کی رائے لکھیے۔

۳۔ شاعر نے صبا کو جو مشورہ دیا ہے، اسے لکھیے۔

* سبب بیان کیجیے۔

۱۔ مکمل نہیں ہے جنونِ تجسّس

۲۔ وہ مجھ سے جگؔر، بدگماں اور بھی ہیں

* درج ذیل کی وضاحت کیجیے۔

۱۔ قفس صورتِ آشیاں

۲۔ جہاں در جہاں

* درج ذیل شعر کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

مقاماتِ اربابِ جاں اور بھی ہیں
مکاں اور بھی لامکاں اور بھی ہیں

* ہدایت کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمی مکمل کیجیے۔

غزل سے تضاد کے اشعار منتخب کر کے لکھیے۔

سرگرمی/منصوبہ :

اسی زمین میں علامہ اقبالؔ کی مشہور غزل تلاش کر کے پڑھیے اور ان دونوں غزلوں کے درمیان موجود فرق پر اپنی رائے لکھیے۔

غزل ۴ : فضؔا ابن فیضی

جان پہچان

فضؔا ابنِ فیضی کا اصل نام فیض الحسن تھا۔ وہ یکم جولائی ۱۹۲۳ء کو مئوناتھ بھنجن (اعظم گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مئو میں مدرسہ جامعہ عالیہ عربیہ اور جامعہ اسلامیہ فیضِ عام سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کے دوران ہی ان کی شاعری کا آغاز ہوگیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں ان کی پہلی نظم شائع ہوئی۔ ۱۹۷۳ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'سفینۂ زرگل' منظر عام پر آیا۔

فضؔا ایک خوش فکر شاعر تھے۔ ان کے کلام میں شگفتگی، روانی اور سادگی پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں جدیدیت کے ساتھ ساتھ روایات کی پاسداری بھی ملتی ہے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں اور رباعیات بھی لکھی ہیں۔ 'شعلۂ نیم باز، دریچۂ سیم تن، شاخِ طوبیٰ، پسِ دیوارِ حرف' اور 'سبزۂ معنیِ بیگانہ' ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں۔ مختلف اداروں نے ان کی علمی و ادبی خدمات پر انھیں انعامات سے نوازا۔ ۱۷؍جنوری ۲۰۰۹ء کو اپنے وطن مئو میں ان کا انتقال ہوا۔

سیم و گہر ، نہ تاج و کمر چاہیے ہمیں
دادِ ہنر ، بہ طرزِ دگر چاہیے ہمیں

زخموں سے چور چور ہیں ، سب کی بصیرتیں
کس سے کہیں ، شعورِ نظر چاہیے ہمیں

ہے رہروانِ شوق کو یہ بانکپن بہت
چہرے پہ بس غبارِ سفر چاہیے ہمیں

اوروں سے مختلف ہے ہمارا معاملہ
شوریدہ سر ہیں ، دشت میں گھر چاہیے ہمیں

تم شوق سے خلاؤں کی پیمائشیں کرو
اپنی زمیں پہ راہ گزر چاہیے ہمیں

یہ ذات کا طلسم ، یہ بے منظری کی دُھند
یوں ہے کہ چشمِ خویش نگر چاہیے ہمیں

تیشہ زنی تو شیوۂ اہلِ قلم نہیں
ہیرے تراشنے کا ہنر چاہیے ہمیں

کیوں اے فضؔا چراغ جلائیں چراغ سے
خورشید اپنا ، اپنی سحر چاہیے ہمیں

معانی واشارات

کمر	-	بلندی
شعورِ نظر	-	بصیرت
شوریدہ سر	-	پریشاں حال
چشمِ خویش نِگر	-	خود کا جائزہ لینے والی آنکھ
تیشہ زنی	-	کدال چلانا

مشقی سرگرمیاں

٭ خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

مقامِ پیدائش		نام
	فضاؔ ابن فیضی	
وفات		تاریخ پیدائش

۲۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

	شعری مجموعے	

٭ ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ شاعر کی خودداری مطلع کے حوالے سے بیان کیجیے۔

۲۔ رہروانِ شوق کے بانکپن کی وضاحت کیجیے۔

۳۔ چشمِ خویش نگر کا مطلب تحریر کیجیے۔

۴۔ تیشہ زنی اور ہیرے تراشنے کے ہنر کا فرق لکھیے۔

۵۔ شاعر کی خواہشیں ترتیب وار لکھیے۔

٭ درج ذیل اشعار کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۱۔ سیم و گہر، نہ تاج و کمر چاہیے ہمیں
داد ہنر ، بہ طرزِ دگر چاہیے ہمیں

۲۔ زخموں سے چور چور ہیں، سب کی بصیرتیں
کس سے کہیں، شعورِ نظر چاہیے ہمیں

۳۔ یہ ذات کا طلسم ، یہ بے منظری کی دُھند
یوں ہے کہ چشمِ خویش نِگر چاہیے ہمیں

٭ اسباب بیان کیجیے۔

۱۔ شاعر کا دشت میں گھر چاہنا۔

۲۔ شاعر کا دوسروں کے چراغ سے چراغ جلانا۔

۳۔ چہرے پہ بس غبارِ سفر چاہیے ہمیں۔

٭ درج ذیل موضوع پر ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

تم شوق سے خلاؤں کی پیائشیں کرو
اپنی زمیں پہ راہ گزر چاہیے ہمیں

غزل ۵ : پروینؔ شاکر

جان پہچان

پروینؔ شاکر کی پیدائش ۲۴ر نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں ہوئی۔ انھوں نے انگریزی میں ایم.اے. کرنے کے بعد لسانیات اور بینک ایڈمنسٹریشن میں بھی ایم.اے. کیا۔ نو سال تک تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد وہ پاکستان سول سروس جوائن کر کے کسٹم ڈپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہیں۔

'خوشبو'، 'صد برگ'، 'خود کلامی' اور 'انکار' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ 'ماہِ تمام' کے نام سے اُن کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں انھیں پاکستان کے اعلیٰ ترین اعزاز 'نشانِ امتیاز' سے نوازا گیا۔ پروینؔ شاکر کی شاعری نسائی احساسات، کیفیات اور جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ ۲۶ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو اسلام آباد کے ایک سڑک حادثے میں ان کی وفات ہوئی۔

اپنی ہی صدا سنوں کہاں تک جنگل کی ہَوا رہوں کہاں تک
ہر بار ہَوا نہ ہوگی دَر پر ہر بار مگر اُٹھوں کہاں تک
دم گھُٹتا ہے، گھر میں حبس وہ ہے خوشبو کے لیے رکوں کہاں تک
پھر آکے ہوائیں کھول دیں گی زخم اپنے رفو کروں کہاں تک
ساحل پہ سمندروں سے بچ کر میں نام ترا لِکھوں کہاں تک
تنہائی کا ایک ایک لمحہ ہنگاموں سے قرض لوں کہاں تک
سُکھ سے بھی تو دوستی کبھی ہو دُکھ سے ہی گلے ملوں کہاں تک
منسوب ہو ہر کرن کسی سے اپنے ہی لیے جلوں کہاں تک

آنچل مرے بھر کے پھٹ رہے ہیں
پھول اُس کے لیے چنوں کہاں تک

معانی واشارات

دم گھُٹنا – سانس رُکنا
زخم رفو کرنا – زخم سینا
منسوب ہونا – نسبت ہونا

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

★ جان پہچان سے موزوں الفاظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

تاریخ پیدائش		مقامِ پیدائش
	پروینؔ شاکر	
تعلیم		ملازمت

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ 'دکھ سے ہی گلے ملوں کہاں تک' سے شاعرہ کی مراد لکھیے۔

۲۔ 'اپنے ہی لیے جلوں کہاں تک' سے شاعرہ نے جس بات کا اظہار کیا ہے، اُسے تحریر کیجیے۔

* درج ذیل اشعار کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۱۔ دم گُھٹتا ہے، گھر میں حبس وہ ہے
خوشبو کے لیے رکوں کہاں تک

۲۔ ساحل پہ سمندروں سے بچ کر
میں نام ترا لِکھوں کہاں تک

۳۔ منسوب ہو ہر کرن کسی سے
اپنے ہی لیے جلوں کہاں تک

* اسباب بیان کیجیے۔

غزل سے اپنی پسند کے شعر منتخب کر کے پسند کی وجہ۔

* درج ذیل شعر پر ذاتی رائے تحریر کیجیے۔

سُکھ سے بھی تو دوستی کبھی ہو
دُکھ سے ہی گلے ملوں کہاں تک

* ہدایات کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ خط کشیدہ لفظوں کے لیے ہم معنی لفظ لکھیے۔

- اپنی ہی صدا سنوں کہاں تک
- ہر بار ہَوا نہ ہوگی دَر پر
- دم گُھٹتا ہے، گھر میں حبس وہ ہے
- سکھ سے بھی تو دوستی کبھی ہو

۲۔ درج ذیل کے ہم صوت الفاظ لکھیے۔

گھر	قرض	کرن	پھول
↓	↓	↓	↓

۳۔ غزل کے قافیے اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔

سرگرمی/منصوبہ :

۱۔ اُردو کی چار شاعرات کے نام، تخلص اور ان کے مجموعۂ کلام کے نام لکھیے۔

۲۔ نسائی ادب سے متعلق معلومات انٹرنیٹ/ رسائل سے جمع کیجیے۔

۳۔ نسائی ادب میں اہم مقام رکھنے والی کسی مصنفہ/ شاعرہ/ ادیبہ سے متعلق تفصیلی تبصراتی و تجزیاتی پروجیکٹ تیار کیجیے۔

شعری قواعد

مجازِ مرسل

ذیل کے جملوں کو پڑھ کر ان کے مفہوم پر غور کیجیے:

۱) • بس دو منٹ میں واپس آتا ہوں۔ (مگر بولنے والا گھنٹے بھر کے بعد واپس آتا ہے) یہ جز بول کر کُل مراد لینا ہے۔
• 'انڈیا جیت گیا' (دراصل ٹیم انڈیا جیتی) یہ کُل بول کر جز مراد لینا ہے۔

۲) • میز پر چائے رکھی ہے۔ (چائے سے بھرا کپ رکھا ہے) یہ مظروف بول کر ظرف مراد لینا ہے۔
• بچہ ٹفن لے کر گیا تھا۔ (ٹفن میں کھانا لے کر گیا تھا) یہ ظرف بول کر مظروف مراد لینا ہے۔

کبھی گفتگو میں یا لکھتے ہوئے ہم لفظوں کو ان کے معلوم معنی سے الگ معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے معنی دو قسم کے ہیں (۱) لغوی معنی یعنی جو معلوم ہیں اور لغت میں لکھے ہوئے ہیں (۲) مجازی معنی جو لغت میں لکھے ہوئے نہیں ہیں مگر بولنے اور سننے والا ان کے معنی اپنی سمجھ کے مطابق طے کر لیتا ہے۔ لفظوں کے ایسے استعمال کو 'مجازِ مرسل' کہتے ہیں۔ مجازِ مرسل ہماری گفتگو میں بہت عام ہے۔

اس کی کئی قسمیں ہیں۔ زبان کا مجازی استعمال شاعری میں بھی خوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً

بوند قسمتی نہیں ہے اب کے سال چرخ گویا ہے آب در غربال

اس شعر میں 'بوند' (جُز) سے مراد 'بارش' (کُل) ہے۔

جز بمعنی کل: مثال

دل کو مرے ہر ایک طرح مطمئن بنا غم دے تو غم کے ساتھ کوئی غمگسار دے

اس شعر میں لفظ 'دل' (جُز) کو 'مرے' یعنی شاعر کی پوری شخصیت (کُل) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

کل بمعنی جز: مثال

مطلب سمجھ میں آئے بقائے دوام کا ایسا سبق یہ زندگیِ مستعار دے

یہاں 'بقائے دوام' (کُل) کو سمجھنے کے لیے 'زندگیِ مستعار' (جُز) کا حوالہ دیا گیا ہے۔

ظرف بمعنی مظروف: مثال

سو بار بیاباں میں گیا محملِ لیلیٰ مجنوں کی طرف ناقہ کوئی گام نہ آیا

بیاباں میں صرف 'محمل' (ظرف) نہیں گیا۔ اس میں 'لیلیٰ' (مظروف) بھی تھی۔

مظروف بمعنی ظرف: مثال

چشم و دل سے جو نکلا ہجراں میں نہ کبھو بحر و کان سے نکلا

یہاں چشم و دل سے نکلنے والی اشیا 'آنسو اور خون' (مظروف) مراد ہیں جو 'بحر و کان' (ظرف) سے نکلتے ہیں۔

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کے شعر میں مجازِ مرسل کی قسم کا نام بتایئے۔

۱۔ گگن کے تل کیں ایسا شہر نادر نہیں دیکھے تھے انکھیاں کے مسافر
۲۔ لوٹتا تھا سوزِ غم سے آگ میں دل جگر سِنکتے تھے دونوں جوں کباب

۳۔ زندگی سے ڈرتے ہو
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں
آدمی سے ڈرتے ہو

لف ونشر

اس کے دست و دل کے رشک و شرم سے
خون ہے دل کان کا ، دریا ہے آب

پہلے مصرعے کے الفاظ 'رشک و شرم' کا ربط 'لف' کہلاتا ہے جبکہ دوسرے مصرعے میں اس ربط کو 'خون/ آب' کی مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ اس عمل کو 'نشر' کہتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس صنف کا نام 'لف ونشر' ہے۔

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کے شعروں میں لف ونشر سے ربط والے الفاظ کو آمنے سامنے لکھیے۔

۱۔ بحر و بر میں جھاڑ دے دامن اگر تو فیض کا
قطرہ دُرِ بے بہا ہو ، لعل سنگِ بے بہا

۲۔ کس قدر ہوتے ہیں ناخوش کس قدر ہوتے ہیں خوش
آپ ہم کو دیکھ کر اور آپ کو ہم دیکھ کر

* اس شعر میں مجازِ مرسل کی قسم بتائیے۔

ترے غم میں نَین سے جو نکلتا ہے انجھو باہر
دؤجا گوہر کہاں ہے جگ میں اُس کی آبداری کا

تجنیسِ خطی

ذیل کا شعر پڑھ کر اس کے قافیوں پر غور کیجیے:

نہ تھا ثانی اوسے روئے زمیں پر
تھے اس کے حکم میں سب بحر ہور بر

اس شعر کے قافیے 'پر - بر' لکھنے میں ایک سے ہیں، ان میں صرف نقطوں کا فرق ہے۔ شعر میں ایسے دو لفظوں کے استعمال کو 'تجنیسِ خطی' کہتے ہیں۔

جب شعر میں ایسے دو لفظ آئیں کہ املا میں ایک جیسے ہوں مگر صرف ایک دو نقطوں کے فرق سے ان کے معنی بدل جاتے ہوں تو ایسی تجنیس کو 'تجنیسِ خطی' کہتے ہیں۔

تجنیسِ زائد/ ناقص

جو کُئی باتاں کی سپیاں کوں پیارے
کرے مطلب کے پُر موتیاں وو سارے

اس شعر کے قافیوں 'پیارے - سارے' میں ایک حرف زائد ہے۔

جب شعر میں ایسے دو لفظ آئیں جن کے املا میں ایک حرف (شروع، درمیان یا آخر میں) زیادہ ہو تو ایسی تجنیس کو 'تجنیسِ زائد' یا 'تجنیسِ ناقص' کہتے ہیں۔

تجنیسِ مذیّل

نہیں عشق سے زرد ، زردار میں ہوں
اگر ہے وہ یوسف ، خریدار میں ہوں

اس شعر میں زرد/ زردار' کے آخر میں دو حروف زائد ہیں۔

جب شعر کے دو یکساں لفظوں میں ایک لفظ کے آخر میں دو حروف زائد آئیں تو ایسی تجنیس کو 'تجنیسِ مذیل' کہتے ہیں۔

مشقی سرگرمیاں

* ذیل کے شعروں میں آنے والی تجنیس کے نام لکھیے۔

۱۔ چشم غضب سے نیم نگہ میرے واسطے
اک نیمچہ ہے زہر میں گویا بُجھا ہوا

۲۔ بلندی سٹ ، سُرج پکڑیا جو پستی
کیا مغرب کے جا معبد میں بستی

۳۔ دیوار کھڑی کرتے ہوئے راہ میں راہی
کہتا ہے کہ سایے کو شجر آئے نہ آئے

بحراور تقطیع

کسی کہانی کو بلند آواز سے پڑھیے۔ آپ اپنی آواز سن کر محسوس کریں گے کہ اس کے لفظوں کو ادا کرتے وقت گویا ہم کسی سے بات کررہے ہوں۔ یہ نثر پڑھنے یا بولنے کا انداز ہے۔ ایسے ہی اگر ہم کوئی نظم بلند آواز سے پڑھیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہماری آواز میں ایک خاص قسم کا اُتار چڑھاؤ یا آہنگ پیدا ہوگیا ہے۔ آہنگ سے پڑھنا شعر پڑھنے کا انداز ہے۔ اسے آوازوں کی موزونیت سے پڑھنا بھی کہتے ہیں۔ موزونیت کا مطلب ہے کہ شعر میں استعمال کیے جانے والے الفاظ ایک خاص وزن رکھتے ہیں۔ یہی شعر کا آہنگ ہے جسے علمی زبان میں 'بحر' کہتے ہیں۔ بحر دراصل شعر کی ادائیگی میں استعمال کیا جانے والا چھوٹی بڑی آوازوں کا ایک نظام ہے۔ مختلف شعروں کا آہنگ یا آوازوں کا نظام مختلف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے شعروں کی بحریں بھی ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں۔ شعروں کی بحر کی آوازوں کی مقدار کے مطابق ہر بحر کا الگ نام ہوتا ہے مثلاً

بحرِ متقارب

✻ ذیل کے مسدس کا ایک بند بلند آواز سے پڑھیے :

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ، وہ کیا تھا   جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانے سے پیوند جس کا جدا تھا   نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا   ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

جب یہ اشعار مسلسل پڑھے جاتے ہیں تو ہمیں اپنی آواز میں ایک خاص آہنگ سنائی دیتا ہے۔ یہی ان شعروں کی بحر کا آہنگ ہے۔
آپ نویں جماعت میں سوؔدا کی یہ غزل پڑھ چکے ہیں۔

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

اس شعر کے بعد غزل کے دوسرے شعروں کا آہنگ بھی اوپر دیے گئے حالؔی کے شعروں کے آہنگ جیسا ہے یعنی دونوں کی بحر ایک ہے۔ اس بحر کے آہنگ کو ظاہر کرنے والی چھوٹی بڑی آوازوں کا جو صوتی رکن بنتا ہے، اس کا نام 'فعولن' ہے اور اس رکن کی تکرار سے بننے والی بحر کا نام 'بحرِ متقارب' ہے۔ اب اس رکن کو تکرار سے پڑھیے :

فعولن فعولن فعولن فعولن
فعولن فعولن فعولن فعولن

آپ محسوس کریں گے گویا ہم اوپر دیے ہوئے اشعار پڑھ رہے ہیں۔ اس رکن 'فعولن' میں 'فَ' چھوٹی آواز ہے اور 'عو' اور 'لُن' بڑی آوازیں ہیں۔ ان آوازوں کو ہم دیے گئے شعروں کے لفظوں کے سامنے رکھیں تو پتا چلے گا کہ شعر کی چھوٹی آوازیں 'فَ' کے مقابل اور بڑی آوازیں 'عولن' کے مقابل آ رہی ہیں جیسے :

عرب جس	کا چرچا	ہے یہ کچھ،	وہ کیا تھا
ف عو لن	ف عو لن	ف عو لن	ف عو لن
ع ربِ جس	کَ چرچا	ہَ یے کچھ	وَ کا تھا
چھ آ ب آ	چھ آ ب آ	چھ آ ب آ	چھ آ ب آ

(چھ آ = چھوٹی آواز، ب آ = بڑی آواز)

نما تھا		جزیرہ		الگ اک		جہاں سے	
عو لن	ف	عو لن	ف	عو لن	ف	عو لن	ف
ما تھا	نُ	زی رہ	ج	لگ اک	ا	ہا سے	ج
ب آ	چھ آ	ب آ	چھ آ	ب آ	چھ آ	ب آ	چھ آ

خیال رہنا چاہیے کہ پہلے مصرعے میں لفظ 'کا'، لفظ 'ہے' اور لفظ 'وہ' چھوٹی آوازوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس مصرعے میں لفظ 'کیا' کی یائے وصلی کو گرا کر 'کا' کر دیا گیا ہے جب کہ لفظ 'یہ' لمبی آواز میں جیسے 'یے'۔ رکن 'فعولن' شعر کے دونوں مصرعوں میں آٹھ مرتبہ آیا ہے اس لیے اس سے بننے والی بحر کو **'بحر متقارب مثمن سالم'** کہتے ہیں۔ (مثمن کے معنی عربی میں آٹھ ہیں)

اوپر کے تجزیوں میں ہم نے شعر کو بحر کے رکن 'فعولن' کے وزن پر جانچا۔ اس عمل کو **'تقطیع'** کہتے ہیں۔

شعر کی تقطیع کے اِن اصولوں کو یاد رکھیے:

۱۔ چھوٹی آواز کے سامنے چھوٹی اور بڑی آواز کے سامنے بڑی آواز آتی ہے۔
۲۔ ساکن حرف کے سامنے ساکن اور متحرک کے سامنے متحرک حرف آتا ہے۔
۳۔ کبھی چھوٹی آواز کو بڑی آواز کی طرح پڑھنا پڑتا ہے۔
۴۔ کبھی بڑی آواز کو چھوٹی آواز کی طرح بھی پڑھنا پڑتا ہے۔
۵۔ کبھی زیر اضافت کو 'ے' کی طرح بڑی آواز میں پڑھتے ہیں۔
۶۔ ہکاری آوازیں (بھ، جھ، کھ وغیرہ) ایک آواز شمار کی جاتی ہیں (ب، ج، ک وغیرہ)
۷۔ 'ں' کو تقطیع میں شمار نہیں کیا جاتا یعنی غنہ منفرد آواز نہیں ہے۔
۸۔ تشدید والی آوازیں دو آوازیں مانی جاتی ہیں۔
۹۔ تقطیع میں وہی آوازیں شمار کی جاتی ہیں جن کو ادا کیا جاتا ہے۔ ان کا شمار نہیں ہوتا جو صرف لکھی جاتی ہیں، ادا نہیں کی جاتی۔

بحرِ ہزج

آتش کے درج ذیل اشعار بلند آواز سے پڑھ کر ان کی موزونیت پر توجہ دیجیے:

محبت کا تری بندہ ہر اک کو، اے صنم پایا ۔۔۔ برابر گردنِ شاہ و گدا دونوں کو خم پایا
ہزاروں حسرتیں جاویں گی میرے ساتھ دنیا سے ۔۔۔ شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا
سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خرابے میں ۔۔۔ غنیمت جان، جو آرام تو نے کوئی دم پایا

آپ پڑھ چکے ہیں کہ بحر متقارب کے رکن میں تین آوازیں ہیں: ایک چھوٹی (فَ) اور دو بڑی (عو اور لن)۔ آتش کے اشعار پڑھنے سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان میں بھی چھوٹی بڑی آوازیں سنائی دیتی ہیں: ایک چھوٹی 'مَ' اور تین بڑی 'فا عی لن'۔ ان آوازوں کے ملنے سے شعر کے آہنگ کا جو وزن بنتا ہے اسے 'مفاعیلن' (مفا عی لن) کہتے ہیں اور اس سے بننے والی بحر کا نام **'بحرِ ہزج'** ہے۔

رکن مفاعیلن کو تکرار سے پڑھیے:

مفاعی لُن مفاعی لُن مفاعی لُن مفاعی لُن
مفاعی لُن مفاعی لُن مفاعی لُن مفاعی لُن

آپ کو یہاں یہی محسوس ہوگا گویا ہم آتش کے اشعار پڑھ رہے ہوں۔ مفاعیلن کی تکرار کو ہم دیے گئے شعروں کے سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ شعر کی چھوٹی آوازیں 'م' کے سامنے اور بڑی آوازیں 'فاعی لُن' کے سامنے آرہی ہیں جیسے :

محبت کا		تری بندہ		ہراک کوا ے		صنم پایا	
م	فاعی لن	م	فاعی لن	م	فاعی لن	م	فاعی لن
م	حب بت کا	تِ	ری بندہ	ہَ	رک کواَ ے	صَ	نم پایا
چھ آ	ب آ	چھ آ	ب آ	چھ آ	ب آ	چھ آ	ب آ

برابر گر		د نِ شاہ و		گدا دونوں		کوخم پایا	
م	فاعی لن	م	فاعی لن	م	فاعی لن	م	فاعی لن
ب	را بر گر	د	نے شاہو	گ	دا دونو	کُ	خم پایا
چھ آ	ب آ	چھ آ	ب آ	چھ آ	ب آ	چھ آ	ب آ

خیال رہے کہ دوسرے مصرعے کی تقطیع میں 'گردنِ شاہ و' کا فقرہ ٹوٹ جائے گا۔ 'گر' پہلے حصے میں آتا ہے اور لفظ 'گردنِ' کو 'گردنے' پڑھیں گے۔ اسی طرح 'کوخم پایا' میں 'کو' چھوٹی آواز 'کُ' بن جائے گا۔ رکن 'مفاعیلن' شعر کے دونوں مصرعوں میں آٹھ بار آتا ہے اس لیے اس بحر کو **'بحر ہزج مثمن سالم'** کہتے ہیں۔

مشقی سرگرمیاں

٭ ذیل کے شعروں کی تقطیع کیجیے۔

۱۔ وہی شوکت عیاں ہے اس کے تیور اور قرینے سے
اڑے جاتے ہیں نقشِ دشمنی دل کے نگینے سے

۲۔ عطا کر دے وہی طاقت جو اک دن تھی مرے بس میں
جوانی کا لہو پھر جوش مارے میری نس نس میں

۳۔ صبا خاک دل سے بچا اپنا دامن
ابھی اس میں چنگاریاں اور بھی ہیں

۴۔ زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا
نہ کشوَر ستاں تھا ، نہ کشوَر کُشا تھا

اضافی مطالعہ

خاکے

خاکہ نگاری :

خاکہ نگاری اُردو کی ایک باضابطہ صنف ہے جس کی روایت بہت پرانی ہے۔ خاکہ نگار جب کسی شخصیت کو موضوع بناتا ہے تو اس شخص کے متعلق واقعات، سوانح، مشاہدات اور اپنے تاثرات کی مدد سے شخصیت کی جیتی جاگتی لفظی تصویر پیش کر دیتا ہے۔ پڑھنے والا اسے بہ یک وقت واقعے کے طور پر بھی پڑھتا ہے اور کہانی کے طور پر بھی۔ خاکے کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی شخص کی ظاہری اور باطنی کیفیات کو خاکہ نگار اپنے تاثرات کے ساتھ دلچسپ انداز میں بیان کرتا ہے۔ خاکہ اور سوانحی مضمون اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ سوانح میں موضوع بننے والی شخصیت کے کارناموں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے اور مصنف سے اس کی سند مانگی جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس خاکے میں کسی شخص کو دیکھنے کا مصنف کا انداز اور اس کے ذاتی تاثرات و قیاسات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

خاکے کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ خاکہ نگار اپنے مشاہدے میں آنے والے کسی بھی شخص کا خاکہ لکھ سکتا ہے۔ اُردو میں ایسے بے شمار لوگوں کے خاکے لکھے گئے ہیں جو سماج اور ادب میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ایسے لوگوں کے خاکے بھی اُردو میں مشہور ہیں جو سماجی اعتبار سے بہت اہم نہیں تھے مثلاً نام دیو مالی (از عبدالحق) اور کندن چپراسی (از رشید احمد صدیقی)۔ اُردو میں خاکے کے ابتدائی نقوش محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' میں ملتے ہیں۔ اُردو کے مشہور خاکہ نگاروں میں مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عنایت اللہ دہلوی، میر ناصر علی، اشرف صبوحی، راشد الخیری، شاہد احمد دہلوی، خواجہ حسن نظامی، سعادت حسن منٹو، مالک رام، مجتبیٰ حسین، صالحہ عابد حسین وغیرہ اہم نام ہیں۔

درج ذیل خاکے ریاست مہاراشٹر کی ادبی اور علمی شخصیات کا ایک مختصر تعارف ہیں۔ یہاں روایت کے ارتقا کی تفصیل نہیں ہے۔ صفحات کی مقررہ حد کے پیش نظر انتخاب ناگزیر تھا۔ اِن خاکوں میں یہ امر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جو تحریریں شامل کی جائیں وہ خاکہ نگاری (مرقع نگاری، چہرہ نگاری) کی اس تعریف سے قریب ہوں جس کی وضاحت خاکہ نگاری کے ضمن میں کی گئی ہے۔ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ جو تحریریں پیش کی جائیں، ان کا تعلق مہاراشٹر کے مخصوص کلچر، مہاراشٹر کی زبان اور محاورے، مہاراشٹر کی سیاسی اور سماجی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے ہو۔ یہاں عوام اور خواص کی کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے۔

لکھنے والا (خاکہ نگار) مہاراشٹر کا رہنے والا ہو یا اس نے مہاراشٹر میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہو یا کم از کم پچیس تیس برسوں تک لگاتار مہاراشٹر میں رہا ہو۔ اس کتاب میں شامل تمام خاکوں کے موضوع ایسے افراد ہیں جو صفِ مرحومین میں شامل ہو چکے ہیں۔ زندہ شخصیات کے خاکے شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ خاکے جس شکل میں موصول ہوئے تھے، انھیں درسی کتاب کی ضرورت کے مطابق قطع و برید کے ساتھ شامل کیا جا رہا ہے۔

۱

منٹو : میرا دوست، میرا دشمن

عصمت چغتائی

جان پہچان

(۱) عصمت چغتائی : عصمت چغتائی ۲۱؍اگست ۱۹۱۵ء کو بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ ان کا بچپن جے پور اور آگرہ میں گزرا۔ وہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم پائی۔ بی۔اے۔ اور بی۔ ایڈ۔ کی ڈگریاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ مختلف اسکولوں میں ملازمت کرنے کے بعد وہ ممبئی میں مدارس کی انسپکٹریس ہوگئیں۔ وہ فلمی دنیا سے بھی وابستہ تھیں۔ ان کی ذہنی تربیت ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ہوئی تھی۔

عصمت چغتائی نے ناول، افسانے اور رپورتاژ لکھے۔ انھیں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت ملی۔ 'دو ہاتھ'، 'چھوئی موئی' 'کلیاں' اور 'چوٹیں' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ 'ضدی'، 'ٹیڑھی لکیر'، 'معصومہ'، 'سودائی' اور 'ایک قطرۂ خون' ان کے اہم ناول ہیں۔ انھیں عورتوں کی زبان اور محاورات کے استعمال میں مہارت حاصل تھی۔ عصمت نے کچھ خاکے بھی لکھے۔ ان میں 'دوزخی' بہت مشہور ہوا جو انھوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی پر لکھا ہے۔ 'بمبئی سے بھوپال تک' ان کا ایک یادگار رپورتاژ ہے۔ عصمت کی تحریروں کی خاص پہچان ان کی طنز آمیز زبان ہے۔ مسلم گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے طرزِ زندگی اور نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کا انتقال ۲۴؍اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ممبئی میں ہوا۔

(۲) سعادت حسن منٹو : سعادت حسن منٹو ۱۱؍مئی ۱۹۱۲ء کو لدھیانہ کے گاؤں سمبرالہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے لیکن زیادہ دنوں تک تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور جلد ہی ملازمت اختیار کر لی۔ اخبار 'مساوات' (امرتسر) اور ہفت روزہ 'مصوّر' (ممبئی) وغیرہ میں بھی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے لیے ریڈیائی ڈرامے اور فیچر بھی لکھے۔ بعد میں وہ ممبئی میں فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ تقسیم وطن کے بعد انھوں نے لاہور میں سکونت اختیار کی اور ۱۸؍جنوری ۱۹۵۵ء کو وہیں ان کا انتقال ہوا۔

منٹو اُردو کے ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے ان کے افسانے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'آتش پارے' منظرِ عام پر آیا۔ بعد میں ان کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ 'نیا قانون'، 'ٹھنڈا گوشت'، 'کالی شلوار'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، 'موذیل' اور 'ہتک' ان کے اہم اور مشہور افسانے ہیں۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ مضامین، خاکے اور کئی فلموں کے اسکرپٹ بھی لکھے۔ 'گنجے فرشتے' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔

اڈلفی چیمبر کی چوبی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی، جیسی کبھی امتحان کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ مجھے ویسے ہی نئے آدمیوں سے ملتے گھبراہٹ ہوا کرتی تھی لیکن یہاں تو وہ 'نیا آدمی' منٹو تھا جس سے پہلی بار ملنے جا رہی تھی۔ میری گھبراہٹ وحشت کی حدوں کو چھونے لگی۔ میں نے شاہد سے کہا، ''چلو واپس چلیں، شاید منٹو گھر پر نہ ہو۔'' مگر شاہد نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

''وہ شام کو گھر ہی پر رہتا ہے۔''

یہ لیجیے مرے پر سوڈُرّے۔ مگر میں نے جی کڑا کر لیا۔ ایسا بھی سوچا۔ مجھے کھا تو نہیں جائے گا! ہونے دو جو اس کی زبان کی نوک

پر ڈنک ہے۔ میں بلبلہ تو ہوں نہیں جو پھونک ماری تو بیٹھ جاؤں گی۔ چرچراتی گردآلود سیڑھیاں طے کرکے ہم منزل پر پہنچے۔ فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ ڈرائنگ روم نما کمرے میں ایک کونے میں صوفہ سیٹ تھا۔ دوسری طرف ایک بڑا سا سفید اور صاف پلنگ پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملی ہوئی ایک لدی پھندی بڑی میز کے سامنے ایک بڑی سی کرسی میں ایک باریک مکوڑے کی شکل کا انسان اُکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

''آیئے آیئے۔'' بڑی خندہ پیشانی سے منٹو کھڑا ہو گیا۔ منٹو ہمیشہ کرسی پر اُکڑوں بیٹھا کرتا تھا اور بہت مختصر نظر آتا تھا لیکن جب کھڑا ہوتا تھا تو کھنچ کر اس کا قد خاصا لمبا نکل آتا تھا اور بعض وقت جب منٹو یوں رینگ کر کھڑا ہوتا تھا تو بڑا زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر کھدر کا کُرتا پاجامہ اور جواہر کٹ صدری تھی۔

''ارے میں سمجھتا تھا کہ آپ نہایت کالی، دبلی، سوکھی، مریل سی ہوں گی۔'' اس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

''اور میں سمجھتی تھی آپ نہایت دبنگ قسم کے چنگھاڑتے ہوئے پنجابی ہوں گے۔''

اور دوسرے لمحے ہم دونوں پوری تندہی سے جٹ کر بحث کرنے لگے کہ دو تین بار بات اُلجھ گئی لیکن ذرا سا تکلف باقی تھا، لہٰذا دوسری ملاقات کے لیے اُٹھا رکھی۔ کئی گھنٹے ہمارے جبڑے مشینوں کی طرح مختلف موضوعات پر جملے کترتے رہے اور میں نے جلد ہی معلوم کیا کہ میری طرح منٹو بھی بات کاٹنے کا عادی ہے۔ پوری بات سننے سے پہلے ہی بول اُٹھتا ہے اور جو رہا سہا تکلف تھا، وہ بھی غائب ہو گیا۔ باتوں نے بحث اور بحث نے باقاعدہ نوک جھونک کی صورت اختیار کرلی اور صرف چند گھنٹوں کی جان پہچان کے بل بوتے پر ہم نے ایک دوسرے کو نہایت ادبی قسم کے لفظوں میں احمق، جھکّی اور کج بحث کہہ ڈالا۔

گھمسان کے بیچ مَیں نے ایک بار کنارے ہوکر غور سے دیکھا۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے لپکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھیں جنھیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ مور کے پر یاد آ گئے۔ مور کے پر اور آنکھوں کا کیا جوڑ؟ یہ مجھے کبھی نہ معلوم ہوسکا مگر جب بھی میں نے ان آنکھوں کو دیکھا، مجھے مور کے پر یاد آ گئے۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بے ساختہ شگفتگی مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انھیں تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ قہقہہ لگاتے، سنجیدگی سے مسکراتے، طنز کے نشتر برساتے اور پھر نزع کے عالم میں پتھراتے! وہی نازک نازک ہاتھ پیر، سر پر ٹوکرا بھر بال، پچکے زرد زرد گال اور کچھ بے تکے سے دانت۔ نہ جانے کس بات پر میں نے کہا، ''یہ بالکل غلط۔'' اور ہم باقاعدہ لڑ پڑے۔

''آپ کج بحثی کر رہی ہیں۔''

''حماقت ہے یہ!''

''دھاندلی ہے، عصمت بہن!''

''آپ مجھے بہن کیوں کہہ رہے ہیں۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''نہیں کہتا۔''

''میرے بارے میں میرے بھائیوں کے خیالات بھی کچھ خوش گوار نہیں ہیں۔ یہ آپ کو کھانسی ہے۔ اس کا علاج کیوں نہیں کرتے؟''

''علاج؟ تین سال ہوئے ڈاکٹروں نے کہا تھا سال بھر میں مر جاؤ گے، تمھیں ٹی. بی. ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ میں نے نہ مر کر ان کی پیشین گوئی کو سچا ثابت نہ ہونے دی۔ ان سے تو میسمر یزم اور جادو کرنے والے زیادہ عقل مند ہوتے ہیں۔''

''یہی آپ سے پہلے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔''

''کون بزرگ؟''

''میرے بھائی، عظیم بیگ، نو من مٹی کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔''

تھوڑی دیر ہم عظیم بیگ کے فن پر بحث کرتے رہے۔ آئے تھے صرف ملاقات کرنے لیکن باتوں میں رات کے گیارہ بج گئے۔ شاہد، جو ہماری جھڑپیں الگ تھلگ بیٹھے دیکھ رہے تھے، بھوک سے تنگ آ چکے تھے۔ ملاڈ پہنچتے پہنچتے ایک بج جائے گا لہٰذا کھانا کھا ہی لیا جائے۔ منٹو نے مجھ سے الماری سے پلیٹیں اور چمچے نکالنے کو کہا اور خود ہوٹل سے روٹی لینے چلا گیا۔

''ذرا اس برنی سے اچار نکال لیجیے۔'' منٹو نے تیزی سے میز پر کھانا لگایا اور کرسی پر اُکڑوں بیٹھ گیا۔ وہی میز جو دم بھر پہلے ادبی کارگزاریوں کا میدان بنی ہوئی تھی، ایک دم کھانے کی میز کی خدمات انجام دینے لگی اور بغیر کسی سے ''پہلے آپ'' کہے ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا، جیسے برسوں سے اسی طرح کھانے کے عادی ہوں۔

منٹو فلمستان میں قریب قریب مستقل تھا۔ وہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔ مدح سرائی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی، اسے ملتی تھی کہ اس کی فلم 'آٹھ دن' کامیاب نہ ہوئی۔ نہ جانے کیوں وہ فلمستان چھوڑ کر اشوک کمار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا۔ اسے اشوک کمار بہت پسند تھا۔ مکر جی نے نہ جانے اسے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ایک دم ان کے خلاف ہو گیا۔

''بکواس ہے مکر جی۔ فراڈ ہے پکا!'' وہ تلخی سے کہتا۔

بمبئی ٹاکیز میں جا کر اس نے مجھے بھی کمپنی میں ایک سال کے لیے سینیریو ڈپارٹمنٹ میں کام دِلوا دیا اور بہت ہی خوش ہوا۔ اب ہم دونوں مل کر کہانی لکھیں گے۔ تہلکہ مچ جائے گا۔ میری اور آپ کی کہانی، اشوک کمار ہیرو، بس پھر دیکھیے گا۔''

مگر منٹو کی کہانی رہ گئی! منٹو دن بھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی کہانی کی اُدھیڑ بُن کیا کرتا۔ کبھی انجام کو آغاز بنا کر لکھتا کبھی آغاز کو انجام بنا کر، کبھی وسط سے شروع کر کے آغاز پر ختم کرتا اور وسط کو انجام بنا دیتا۔ باوجود ہزاروں آپریشنوں کے کہانی کی کوئی کل اشوک کمار کو پسند نہ آئی۔ مگر منٹو یہی کہتا:

''آپ گنگولی کو نہیں سمجھتیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ وہ میری کہانی میں ضرور کام کرے گا۔''

''آپ کی کہانی میں اس کا رول رومانٹک نہیں، باپ کا ہے۔ وہ کبھی نہیں کرے گا۔'' اور منٹو سے پھر لڑائی ہونے لگتی۔ مگر ادبی زبان سے، یہاں اپنی فکر پڑی تھی۔ اور وہی ہوا کہ 'ضدی' اور 'محل' بن گئیں۔ منٹو کی کہانی رہ گئی۔ منٹو کو اس کی امید نہ تھی اور اسے بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جھیل سکتا تھا، بے قدری نہیں جھیل سکتا تھا۔ اُدھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بیوی بچے اسے پاکستان بلانے لگے۔ منٹو نے ہم سے بھی چلنے کو کہا۔ پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔ وہاں ہم ہی ہم ہوں گے۔ بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔ میرے جواب پر منٹو مجھ سے واقعی بددل ہو گیا۔ اتنی لڑائیاں اور جھگڑے میرے اس سے ہوئے مگر یوں کسی سنجیدہ اصول پر بحث نہیں ہوئی۔

اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ منٹو کتنا بزدل ہے۔ کسی بھی قیمت پر وہ اپنی جان بچانے کو تیار ہے۔ اپنا مستقبل بنانے کے لیے وہ بھاگے ہوئے لوگوں کی زندگی کی کمائی پر دانت لگائے بیٹھا ہے اور مجھے اس سے نفرت سی ہوگئی۔

ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اور ملے پاکستان چلا گیا۔ مجھے بڑی ہتک محسوس ہوئی۔ پھر جب اس کا خط آیا کہ وہ بہت خوش ہے۔ بہت عمدہ مکان ملا ہے۔ کشادہ اور خوبصورت قیمتی سامان سے آراستہ۔ ہمیں اس نے پھر بلایا تھا۔ 'ضدی' ختم ہوگئی تھی اور ہم نے 'آرزو' شروع کر دی تھی۔ برے وقت آئے تھے اور چلے گئے تھے۔ اس کے پھر دو خط آئے۔ اس نے بلایا تھا، ایک سینما الاٹ کروانے کی امید دلائی تھی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس کی محبت کا پہلے بھی یقین تھا مگر اب تو اور بھی مان جانا پڑا۔ میں نے اس کے خط پھاڑ دیے اس بات سے چڑ کر کہ وہ میرے اصولوں کی قدر کیوں نہیں کرتا۔ میں نے اسے جانے سے نہیں روکا۔ پھر وہ مجھے اپنے راستے پر کیوں گھسیٹ رہا ہے۔

پھر سنا منٹو بہت خوش ہے۔ مکان چھن گیا مگر دوسرا مکان بھی خاصا اچھا ہے۔ ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ اور سال گزرتے گئے۔ ایک لڑکی اور پیدا ہوئی۔ منٹو کا ایک خط آیا ''کوشش کر کے مجھے ہندوستان بلوالو۔''

پھر معلوم ہوا منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل ہوگئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا، بلکہ کچھ ایسا لوگوں کا رویہ تھا کہ اچھا ہوا، جیل ہوگئی۔ اب دماغ درست ہو جائے گا۔ نہ کہیں جلسے ہوئے، نہ میٹنگیں ہوئیں، نہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔

پھر معلوم ہوا کہ دماغ چل نکلا اور پاگل خانے میں یار دوست پہنچا آئے ہیں۔

مگر ایک دن منٹو کا خط آیا۔ بالکل ہوش وحواس میں لکھا تھا کہ اب بالکل ٹھیک ہوں اگر مکر جی سے کہہ کر بمبئی بلوا لو تو بہت اچھا ہو۔ اس کے بعد عرصے تک کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ نہ ہی میرے خط کا جواب آیا۔ پھر سنا کہ دوبارہ پاگل خانے چلے گئے۔ اب منٹو کی خبروں سے ڈر سا لگتا تھا۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خدا جانے اس کا اگلا قدم کہاں پڑا ہو مگر پاگل خانے سے آگے جو قدم پڑتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں سے بھی اتنی کڑوی خبریں سنیں کہ جی اُوب گیا۔ بے طرح پینے لگے ہیں۔ اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر سامنے مضمون لکھواتے ہیں پیشگی پیسہ دو، سب کھا جاتے ہیں۔

منٹو کا آخری خط آیا جس میں ایک مضمون اپنے اوپر لکھنے کو کہا تھا اور بے ساختہ میری منحوس زبان سے نکل گیا کہ اب تو مرنے کے بعد ہی مضمون لکھوں گی۔

اور آج منٹو کے مرنے کے بعد میں لکھ رہی ہوں۔ منٹو ہی نہیں، عرصہ ہوا میرے اور منٹو کے درمیان بہت کچھ مر چکا تھا۔ آج صرف ایک کسک زندہ ہے، یہ پتا نہیں چلتا کہ کس بات کی کسک ہے؟ کیا اس بات کی ندامت ہے کہ وہ مر چکا ہے اور میں زندہ ہوں؟ یہ میرے سینے پر پھر قرض جیسا بوجھ کیوں ہے۔ مجھے تو منٹو کا کوئی قرضہ یاد نہیں اور اُس کا قرضہ بھی کیا تھا، یہی نا کہ اس نے مجھے بہن کہا تھا۔ مگر بہنیں تو کھڑی بھائیوں کو دم توڑتا دیکھتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں۔ مرنے والے زخم لگا جاتے ہیں، جو نہ دُکھتا ہے نہ رِستا ہے خاموش سلگتا رہتا ہے۔

معانی و اشارات

میسمریزم	– ایک علم جس کے ذریعے دوسروں کے خیالات پر قابو پایا جاسکتا ہے
ہتک	– بے عزّتی
مکرجی	– سُشدھر مکرجی جو اشوک کمار کے بہنوئی اور 'فلمستان' کے مالک تھے۔
ریزولیوشن	– قرارداد (Resolution)
اُدھیڑ بُن	– کشمکش، تذبذب

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

تاریخِ پیدائش		مقامِ پیدائش
	عصمت چغتائی	
ملازمت		تاریخِ وفات

۲۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

	عصمت چغتائی کے ناول	

۳۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

تاریخِ پیدائش		مقامِ پیدائش
	سعادت حسن منٹو	
تاریخِ وفات		مقامِ وفات

۴۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

	منٹو کی تصانیف	

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ منٹو کے فلیٹ کی حالت کے بارے میں لکھیے۔
۲۔ مصنفہ کے ذریعے بیان کیا گیا منٹو کا سراپا تحریر کیجیے۔
۳۔ ڈاکٹروں سے متعلق منٹو کے خیالات قلم بند کیجیے۔
۴۔ منٹو، عصمت چغتائی اور اشوک کمار کا واقعہ بیان کیجیے۔
۵۔ مصنفہ نے منٹو کی زندگی کے آخری ایام کا جو نقشہ کھینچا ہے اُسے لکھیے۔

* درج ذیل جملوں کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۱۔ شاید رعونت اور گستاخی کے ساتھ ساتھ ان میں بے ساختہ شگفتگی، مجھے مور کے پروں کی یاد دلاتی تھی۔
۲۔ اُس کا قرضہ بھی کیا تھا، یہی نا کہ اُس نے مجھے بہن کہا تھا۔

* ہدایت کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمی مکمل کیجیے۔

سبق سے محاورے تلاش کر کے ان کے معنی لکھیے اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

۲ عرف باقر مہدی

یوسف ناظم

جان پہچان

(۱) یوسف ناظم : یوسف ناظم اُردو کے مشہور طنز و مزاح نگار تھے۔ وہ ۱۸؍نومبر ۱۹۱۸ء کو جالنہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد سے ایم.اے. کی ڈگری حاصل کی۔ ملازمت کے بعد ڈپٹی لیبر کمشنر کے طور پر وظیفہ یاب ہوئے۔

انھوں نے کئی اخبارات و رسائل میں کالم لکھے۔ ان کے مضامین اور کالم طنز اور شگفتگی کا حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوبِ نگارش دلچسپ اور سلجھا ہوا ہے۔ ’کیف و کم، فٹ نوٹ، فقط، بالکلیات‘ وغیرہ ان کے مضامین کے مجموعے ہیں۔ ان کی کتاب ’پلک نہ مارو‘ بچوں کے لیے لکھے گئے دلچسپ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یوسف ناظم ممبئی میں قیام پذیر تھے۔ وہیں ۲۳؍ جولائی ۲۰۰۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔

(۲) باقر مہدی : باقر مہدی ۱۱؍فروری ۱۹۲۷ء کو لکھنؤ کے قریب ایک قصبے ردولی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور زندگی کا بڑا حصہ ممبئی میں گزارا۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ’ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں‘ کے علاوہ ’سیاہ سیاہ‘ ان کی شاعری کا کلیات ہے۔ ’آگہی و بے باکی‘ اور ’تنقیدی کشمکش‘ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ باقر مہدی کا شمار جدیدیت سے وابستہ ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری میں نئے نئے تجربوں کو راہ دی۔ باقر مہدی نے نظمیں اور غزلیں دونوں میں طبع آزمائی کی۔ ان کا انتقال ۲۳؍ستمبر ۲۰۰۷ء کو ممبئی میں ہوا۔

باقر مہدی کے نئے مجموعۂ کلام ’ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں‘ کی اشاعت پر ممبئی کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک ادبی نشست ۱۰؍دسمبر ۱۹۷۲ء کو منعقد ہوئی۔ یہ مضمون اسی جلسے میں پڑھا گیا۔ مضمون پڑھنے سے پہلے راقم نے حاضرینِ جلسہ کے روبرو صاحبِ محفل سے یہ اقرار نامہ لکھوایا کہ وہ اس مضمون کے بارے میں راقم سے کوئی بازپُرس نہیں کریں گے۔

ایسا نہیں ہے کہ باقر مہدی صاحب کتابی صورت میں پہلی بار چھپے ہوں۔ ان کی کم سے کم تین کتابیں پہلے بھی شائع ہو چکی ہیں لیکن جب ان کی آخری نظموں کا مجموعہ شائع ہوا تو ان کے قریب کے دوستوں کو بڑی مسرت ہوئی اور اسی مسرت کے اظہار کے سلسلے میں اُنھوں نے یہ جلسہ منعقد کیا کہ باقر مہدی صاحب کو ان کی آخری نظموں کی اشاعت پر مبارک باد دی جائے۔ معلوم نہیں باقر مہدی صاحب کی نکتہ رس نگاہ اس نکتے پر کیوں نہیں پڑی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ اپنے دوستوں سے اس ذہانت کی توقع نہ رکھتے ہوں۔ بہرحال مجھے بھی اس خوشی میں شریک ہونا تھا اس لیے میں بھی ان کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت لے کر حاضر ہوا ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ آج کل کے زمانے میں عقیدت کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

باقر مہدی شاعر ہیں، نقاد ہیں، مقرر ہیں لیکن اپنے غیر مربوط مضمون میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور تنقیدی شعور کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔ یوں ناانصافی سے باقر مہدی صاحب کو بڑا شغف رہا ہے لیکن مجھے ان کی صحبت کا فیض

حاصل ہونے کے باوجود ناانصافی کی مشق نہیں ہوئی ہے اس لیے میں اس سے احتراز ہی کروں گا اور صرف ان کی شخصیت کے بارے میں رفاہِ عام کی خاطر کچھ عرض کروں گا۔ مَیں جو کچھ عرض کروں گا، اس سے میرا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ خود اپنے آپ سے متفق نہ ہونے کا فن میں نے صاحب موصوف سے سیکھا ہے۔ موصوف اپنے آپ سے بھی متفق نہیں ہوا کرتے۔ اختلاف رائے کی یہ منزل تنقید کے میدان میں آخری منزل سمجھی جاتی ہے۔ باقر مہدی کو اس منزل پر پہنچے ہوئے مدت ہوگئی۔

یہ کوئی افواہ نہیں بلکہ نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ باقر مہدی صاحب بھی ردولی جیسے مردم خیز علاقے میں پیدا ہوئے۔ نقادوں کو یوں بھی قدرت کی طرف سے کھلی اجازت ہے کہ وہ جہاں چاہیں پیدا ہو جائیں۔ باقر مہدی کی ولادت سے ان کے وطنِ مالوف کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان کے بعد پھر کسی نقاد کی ہمت نہیں ہوئی کہ ردولی میں پیدا ہو۔ باقر مہدی نے لکھنؤ میں تعلیم پائی (جو کچھ انھوں نے پایا اسے تعلیم ہی کہا جاتا ہے) جب بھی کوئی شخص لکھنؤ کے تکلف اور وہاں کے آداب اور تکلّفات کا ذکر کرتا ہے، میں باقر مہدی صاحب کے حوالے سے اس کی تردید کرتا ہوں اور وہ شخص بالکل مطمئن ہو جاتا ہے۔ باقر مہدی کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا تابناک ہے اور اگر چار نہیں تو کم سے کم تین دانگ عالم میں ضرور مشہور ہے۔

باقر مہدی صاحب کے متعلق میں نے دو رائیں کبھی نہیں سنیں۔ پورا ہندوستان یعنی غیر منقسم ہندوستان اس بات پر متفق ہے کہ باقر مہدی جتنے عالم ہیں اس سے زیادہ ظالم ہیں۔ ان کی بے باکی کی داستانیں چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ ان کی بے باکی وہ معمولی بے باکی نہیں جس کا دعویٰ بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ ان کی بے باکی اور سفاکی میں ذرا سا ہی فرق ہے۔ اُردو کے سارے ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں خوف کی جو ہلکی سی لہر دوڑتی رہتی ہے، اس لہر کا نام باقر مہدی ہے۔ شامت کا مارا جو بھی ادیب اور شاعر ممبئی آتا ہے، باقر مہدی اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے وطن تک جانے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ اس کارِ خیر کے سلسلے میں دور دراز مقامات تک ہو آئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ابھی ان کے ارمان کم ہی نکلے ہیں۔

غالبًا دو سال ہوئے کہ لندن یونیورسٹی کے اُردو کے پروفیسر رالف رسل غلطی سے ممبئی آ گئے۔ ان کی آمد سے متعلق باقر مہدی صاحب کے ایک دوست خورشید الاسلام نے انھیں خط لکھا کہ رالف رسل میرے اچھے دوست ہیں، تم سے ملنے آئیں گے، خدا کے لیے ان سے لڑنا مت...... افسوس، صد افسوس کہ خورشید الاسلام کا یہ خط باقر مہدی کو تین بجے ملا جب کہ ایک بجے تک وہ رالف رسل سے لڑکر فارغ ہو چکے تھے۔ اس واقعے کے راوی باقر مہدی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بات یہیں ختم نہیں ہوئی ہوگی، اس کے بعد وہ یقیناً خورشید الاسلام سے لڑے ہوں گے کہ انھوں نے یہ خط ٹھیک وقت پر کیوں نہیں بھیجا۔

باقر مہدی صاحب کو پہلی مرتبہ میں نے جگر مرادآبادی مرحوم کے تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے سنا تھا۔ جگر مرادآبادی کے مرنے میں کچھ کسر باقی رہ گئی تھی، باقر مہدی صاحب نے اپنی تقریر سے پوری کردی...... باقر مہدی صاحب روایت شکن آدمی ہیں، اتنے روایت شکن کہ ان کی پیشانی ہمیشہ شکن آلود رہتی ہے۔ یوں بھی نقاد کو تنقید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ چاہے موقع تعزیت کا ہو یا تہنیت کا۔

باقر مہدی صاحب مجھ پر بہت مہربان رہے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ باعلم آدمی ہیں اور میں لاعلم! وہ ایزرا پاؤنڈ کا ذکر کرتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں یہ کس ملک کا سکہ ہے۔ وہ اس کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں تو مجھے پوچھنا پڑتا ہے کہ عذرا کہاں کی

رہنے والی تھیں اس لیے مجھ جیسے لاعلم شخص سے اختلاف رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دس بیس سیڑھیاں نیچے اترنی پڑتی ہیں اور یہ کام باقر مہدی نہیں کر سکتے۔ باقر مہدی علم کی اس بلندی پر ہیں جہاں خود علم کے پہنچنے میں ابھی دیر ہے!

مجھ سے ایک مرتبہ البتہ بھول ہوئی۔ میں نے مکتبہ جامعہ میں بیٹھ کر جہاں ہر قسم کی الٹی سیدھی باتیں ہوا کرتی ہیں (الٹی اس لیے کہ باقر مہدی صاحب وہیں بیٹھتے ہیں!) کسی دن یہ کہہ دیا کہ میں باقر مہدی کے اشعار کو منظوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن میری یہ مہمل بات کسی چہیتے دوست نے باقر مہدی صاحب تک پہنچا دی۔ باقر مہدی صاحب مجھ سے کامل تین ماہ تک خفا رہے۔ آہ! وہ کتنے خوشگوار دن تھے!

ایسا ہی ایک سانحہ اور بھی گزرا ہے۔ حیدرآباد کے کسی رسالے میں یہ خبر چھپ گئی کہ میں نے وہاں ایک ادبی جلسے میں یہ کہہ دیا کہ باقر مہدی، قاضی سلیم کو شاعر تسلیم نہیں کرتے۔ باقر مہدی صاحب کسی اور کی کہی ہوئی سچ بات کا بہت برا مانتے ہیں۔ یہ بات بھی انھیں ناگوار گزری۔ مکتبہ جامعہ میں انھوں نے میری خبر لی۔ میں نے صرف اتنا عرض کیا کہ اگر وہ قاضی سلیم کو شاعر مانتے ہیں تو اس کا اعلان کر دیں اور پھر باقر مہدی صاحب نے ماہنامہ 'صبا' میں ایک خط چھپوایا کہ وہ قاضی سلیم کو شاعر مانتے ہیں۔ اس وقت سے باقر مہدی اپنے اعلان پر قائم ہیں حالانکہ قاضی سلیم بھی 'صبا' میں اپنا خط چھپوا چکے تھے کہ کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے شاعری میں کیا فرق پڑتا ہے لیکن باقر مہدی ہیں کہ قاضی سلیم کو برابر شاعر مانے جا رہے ہیں۔ خود کردہ را علاجے نیست!

باقر مہدی صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلو ان کا روادارانہ مزاج ہے اور وہ سب کو یکساں طور پر ناپسند کرتے ہیں۔ اس میں وہ شدت اور نرمی کا فرق نہیں برتتے۔ باقر مہدی صاحب اس معاملے میں بڑے محتاط ہیں اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں کہ ان کی زبان یا قلم سے کسی کے حق میں کوئی کلمۂ خیر نہ نکل جائے۔ اتنا محتاط آدمی ہمیں تو کیا باقر مہدی کو آئینے میں بھی نہیں ملے گا۔ باقر مہدی چوں کہ اپنی مثال آپ ہیں اس لیے ان کا عکس بھی ان سے مختلف ہے!

اگر سب لوگ پانی کی تلاش میں دریا کی طرف جا رہے ہوں اور صرف ایک شخص ریگستان کی سمت جا رہا ہو تو وہ تنہا شخص سوائے باقر مہدی کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ باقر مہدی صاحب نے یہ وتیرہ اس وقت سے اختیار کیا ہے جب سے انھوں نے بحروں کو توڑ تاڑ کر نالے میں ڈال دیا ہے۔

باقر مہدی کو ممبئی کی جن چیزوں سے نفرت ہے ان میں سے ایک چیز پگڑی ہے۔ ان کے ہاتھوں کسی کی پگڑی بھی اس کے سر پر سلامت نہیں رہی۔

مجھے انھوں نے از راہ کرم الطاف حسین حالؔی کا لقب دیا ہے کیوں کہ اُردو ادب میں وہ سب سے زیادہ اگر کسی کو ناپسند کرتے ہیں تو وہ مولانا حالؔی ہیں۔ ناپسندیدگی کے اظہار کے سلسلہ میں بالواسطہ طریقہ انھوں نے صرف میرے لیے اختیار کیا ہے، اوروں کے ساتھ یہ رعایت نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے بلاواسطہ ہے۔

باقر مہدی صاحب کی شخصیت کا کمال یہ ہے کہ وہ ادب کے کسی موضوع پر ایک مدلل اور مبسوط مضمون لکھ کر اس کی مخالفت میں دوسرا مدلل مضمون لکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک ہی محفل میں، ایک ہی موضوع کی تائید اور مخالفت میں گھنٹوں بول سکتے ہیں۔ باقر مہدی ڈائیلاگ اور مونولاگ دونوں کے ماہر ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ ان کی یہ دونوں چیزیں بے لاگ ہوتی ہیں۔ اچھا ہوا کہ باقر مہدی

صاحب نے وکالت کے پیشے سے شوق نہیں فرمایا ورنہ معلوم نہیں ان کی وکالت سے کتنے بے گناہ پھانسی پر چڑھ جاتے جن میں خود ان کے مؤکل بھی شریک ہوتے۔

ادب کا کوئی بھی سیدھا سادہ مسئلہ ہو، باقر مہدی اسے بڑی صفائی سے اُلجھائیں گے اور بہت دیر تک مسکرائیں گے۔ ان کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ کوئی ادبی جلسہ یا مشاعرہ ہو، لوگ یہ دریافت کرتے ہیں کہ فلاں صاحب آ رہے ہیں نا؟ لیکن باقر مہدی صاحب کے متعلق یہی پوچھا جائے گا کہ اس محفل میں باقر مہدی تو نہیں آ رہے ہیں! اور ایسا نہیں ہے کہ باقر مہدی صاحب کو یہ بات معلوم نہ ہو۔

میں باقر مہدی کی شخصیت کی طرح اپنے اس اُلجھے ہوئے اور غیر مربوط مضمون کو یہ کہہ کر ختم کروں گا کہ باقر مہدی ان لوگوں سے یقیناً مختلف ہیں جن سے ریاضؔ خیرآبادی کو سابقہ پڑا تھا اور جن کے متعلق انھوں نے کہا تھا ۔

بڑے صاف طینت بڑے پاک باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

معانی و اشارات

نکتہ رس	کلام کی باریکیاں سمجھنے والا	رفاہِ عام	عام لوگوں کی بھلائی
شغف	دلچسپی	خود کردہ را علاجے نیست	اپنے کیے کا کوئی علاج نہیں
احتراز	پرہیز، اجتناب		

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

مقام پیدائش		تاریخ پیدائش
	یوسف ناظم	
تاریخ وفات		ملازمت

۲۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

	یوسف ناظم کی تصانیف	

۳۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

تعلیم		تاریخ پیدائش
	باقر مہدی	
تاریخ وفات		کلیات

۴۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

	باقر مہدی کی تصانیف	

* درج ذیل سرگرمیاں ہدایات کے مطابق مکمل کیجیے۔

۱۔ خاکے سے باقر مہدی کی جن خوبیوں کا اظہار ہوتا ہے، انھیں تحریر کیجیے۔

۲۔ خاکے سے ایسے جملے تلاش کرکے لکھیے جن میں مصنف نے باقر مہدی کی بہ ظاہر تعریف کرتے ہوئے ان پر طنز کیا ہے۔

* ذیل کے جملوں سے صحیح متبادل لکھیے۔

۱۔ ''باقر مہدی صاحب کی نکتہ رس نگاہ اس نکتے پر کیوں نہیں پڑی۔'' اس بیان میں 'نکتہ' کے لیے صحیح متبادل ....

(الف) دوستوں کی ذہانت پر اعتماد نہ تھا۔

(ب) آج کل عقیدت کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(ج) دوستوں کو خوشی تھی کہ باقر مہدی کی آخری نظموں کی اشاعت ہوگئی ہے۔

(د) ان کی کم سے کم تین کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

۲۔ خاکہ نگار نے یہ خاکہ ....

(الف) باقر مہدی کی درخواست پر لکھا ہے۔

(ب) باقر مہدی کے ڈر کی وجہ سے لکھا ہے۔

(ج) باقر مہدی کی تعریف میں لکھا ہے۔

(د) باقر مہدی کی شخصیت اجاگر کرنے کے لیے لکھا ہے۔

۳۔ ذیل سے صحیح اور غلط متبادل کو الگ الگ لکھیے۔

رالف رسل سے باقر مہدی کے جھگڑنے کی وجہ ....

(الف) خط دیر سے پہنچنا۔

(ب) باقر مہدی رالف رسل سے واقف نہیں تھے۔

(ج) رالف رسل بھی غصّے کے تیز تھے۔

(د) رالف رسل کا دیر سے پہنچنا۔

* اسباب بیان کیجیے۔

۱۔ مصنف کا باقر مہدی سے 'اقرار نامہ' لکھوانا۔

۲۔ مصنف کے مطابق باقر مہدی کے دوستوں کا مسرور ہونا۔

اضافی معلومات

ایزرا پاؤنڈ (Ezra Pound) : ایزرا پاؤنڈ امریکی شاعر پاؤنڈ ۳۰؍اکتوبر ۱۸۸۵ء کو اِڈاہو (امریکہ) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۰۶ء میں پین سلوینیا یونیورسٹی سے ایم.اے. کیا۔ ۱۹۰۷ء میں اسپین اور اٹلی کا سفر کیا اور آخر انگلستان میں سکونت اختیار کی۔ وہاں ۱۹۱۲ء تک انھوں نے اپنی نظموں کے چار مجموعے شائع کروائے۔ ان کی بہترین نظمیں وہ ہیں جو انھوں نے چینی، جاپانی اور اطالوی شاعری سے متاثر ہوکر لکھی ہیں۔ وہ ۱۹۲۴ء میں اٹلی آ گئے اور دوسری جنگ عظیم کے دوران مسولینی اور فاشزم کی حمایت میں تقریریں نشر کیں۔ ۱۹۴۵ء میں انھیں امریکہ لایا گیا اور غداری کے الزام میں ان پر مقدمہ چلا لیکن عدالت نے انھیں فاترالعقل قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیا۔ ۱۹۶۲ء میں پاگل خانے سے رہا ہوکر وہ اٹلی چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یکم نومبر ۱۹۷۲ء کو اٹلی کے شہر وینس میں ان کا انتقال ہوا۔

پروفیسر رالف رسل ایس.آئی. (Professor Ralph Russell S.I.) : برطانیہ میں 'بابائے اُردو' کہلانے والے اُردو زبان کے استاد رالف رسل ۲۱؍مئی ۱۹۱۸ء کو لندن، برطانیہ میں پیدا ہوئے۔ رالف رسل سولہ سال کی عمر میں کمیونسٹ پارٹی کے رکن بن گئے تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۰ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی اور دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے پر فوج میں بھرتی ہوگئے۔ اس دوران انھوں نے ساڑھے تین سال ہندوستان میں گزارے۔ انھوں نے اُردو اور انگریزی میں مضامین لکھے اور اپنے تخصص کے موضوع پر کئی ادبی سیمیناروں میں شرکت کی۔

۳ چھوڑ کر ہم ساتھ اپنا جائیں گے

عارف خورشید

جان پہچان

(۱) عارف خورشید : عارف خورشید کا اصلی نام عارف علی خاں تھا۔ وہ یکم دسمبر ۱۹۵۰ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ انھیں مطالعے کا بچپن ہی سے شوق تھا جو دھیرے دھیرے لکھنے میں تبدیل ہوتا گیا۔ عارف خورشید نے افسانے، افسانچے، ناولٹ، خاکے، تبصرے، غزل، ثلاثیات وغیرہ اصناف میں طبع آزمائی کی۔ وہ ایک اچھے آرٹسٹ بھی تھے۔ اسی لیے اپنی کتابوں کے ٹائٹل خود بناتے تھے۔ آکاش وانی سے بھی ان کے افسانے اور انشائیے نشر ہوئے۔ انھوں نے کئی ادبی سیمیناروں اور مشاعروں میں شرکت بھی کی۔ ان کے چند افسانوں کے مجموعوں کے نام یہ ہیں: 'آتش لمحوں میں، ٹوٹا ہوا آئینہ، یادوں کے سائبان، قافلے والو سچ کہنا، احساس کا زخمی مجسمہ، اور کچھ بھی نہیں کہانی میں'۔ ان کے علاوہ 'تنظیمِ کثیر رنگی' اور 'رنگِ امتزاج' ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ ۲۲؍ستمبر ۲۰۱۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔

(۲) عصمت جاوید : ڈاکٹر عصمت جاوید کا نام عصمت اللہ اور قلمی نام عصمت جاوید تھا۔ وہ ۲؍اگست ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت بہت عمدہ ماحول میں ہوئی۔ انھوں نے ممبئی کے انجمنِ اسلام میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسمٰعیل یوسف کالج سے بی. اے. کرنے کے بعد وہ اورینٹل ٹرانسلیشن آفس میں ملازم ہوگئے۔ ۱۹۵۴ء میں الفنسٹن کالج ممبئی سے درجۂ اوّل سے ایم. اے. کیا۔ ۱۹۵۸ء میں وہ وِدربھ مہاوِدیالیہ امراوتی میں صدر شعبۂ اُردو مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۰ء تک وہ اورنگ آباد کے گورنمنٹ کالج میں صدر شعبۂ اُردو، فارسی اور مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر انچارج اور ریسرچ گائیڈ بھی رہے۔ اس عرصے میں وہ ایس. ایس. سی. بورڈ، پونے کے بورڈ آف اسٹڈیز اور بال بھارتی کے بالترتیب کنوینر اور چیئرمین رہے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں گیارھویں جماعت کی زبانِ اوّل کی کتاب ڈاکٹر عصمت جاوید نے تنہا مرتب کی تھی۔

عصمت جاوید کا خاص میدان لسانیات تھا۔ وہ شاعر، نقاد، محقق اور مترجم بھی تھے۔ اُردو عروض پر بھی انھوں نے کافی کام کیا۔ وہ ادبی حلقوں میں بے حد مقبول تھے۔ عصمت جاوید کی تصانیف میں سے چند کے نام اس طرح ہیں: 'فکر پیا، لسانیاتی جائزے، اُردو پر فارسی کے لسانی اثرات، نئی اُردو قواعد، قلب ماہیت، تلفظ نما اُردو لغت، اکیلا درخت (شعری مجموعہ)، عکس اسرارِ خودی (اقبالؔ کی اسرارِ خودی کا ترجمہ)، عکس رموزِ بےخودی (اقبالؔ کی فارسی مثنوی کا منظوم ترجمہ)، مراٹھی آموز (اہل اُردو کے لیے مراٹھی گرامر)، باقیاتِ عصمت جاوید (بعد از مرگ شائع کی گئی)۔ ۱۹؍اگست ۲۰۰۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر شیخ عصمت جاوید ۲؍اگست ۱۹۲۲ء کو پونہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالباقی صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان کے والد کے چچا سلیم اللہ کے نام پر ان کا نام عصمت اللہ رکھا گیا۔ ڈاکٹر عصمت جاوید کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ عصمت جاوید شیخ کا رنگ گورا، قد میانہ، جسم توانا، چہرہ بیضوی، گول مٹول شخصیت۔ کسی زمانے میں سر پر بال رہے ہوں گے، آخری عمر میں سر بالوں سے بے نیاز ہوگیا تھا اس لیے بالوں نے گالوں پر ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ جوانی میں مونچھ اور کلین شیو، آنکھیں بڑی بڑی، ناک کھڑی، دانت جمے ہوئے مگر قدرے اُٹھے ہوئے تھے۔ پان کے شوق نے ان کا رنگ روپ بگاڑ دیا تھا۔ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے شوقین تھے۔ لباس بشرٹ، پتلون، خاص موقعوں پر کوٹ، ٹائی، مفلر، جیکٹ وغیرہ۔ آواز شخصیت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ نماز کی پابندی پیشانی پر لکھی تھی۔

روزے کی پابندی کبھی ان کے توانا جسم پر اثر انداز نہیں ہوئی۔

عصمت جاوید بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ چونکہ اورنگ آباد کو وطنِ ثانی بنا چکے تھے، اس لحاظ سے اورنگ آباد کے لیے جو نام باعثِ افتخار ہیں، ان میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ ان کے ہم عصروں میں ایسا کوئی نہیں ہوگا جس نے ان سے استفادہ نہ کیا ہو۔ سبھی ان کی عزّت کرتے تھے، ان کی قابلیت کے دل سے قائل تھے۔ کباڑی پورے میں واقع ان کے دولت کدے کا نام 'پھول بن' تھا ؎

غریب خانۂ جاوید بے نوا ہی سہی
نہیں مقامِ سکوں کوئی پھول بن کی طرح

اورنگ آباد دکن کی اُردو ادب کے لیے زرخیز زمین اور یہاں کی ادبی خوشبو سے معطر فضا ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ کی پہلی کتاب 'فکر پیا' (جو ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی) کی اشاعت کا سبب بنی۔ پھر ان کی کتابوں کی فہرست میں پچیس کتابیں درج ہو گئیں۔

اگر آپ کو مکمل اُردو ادب پڑھنے کی مہلت نہ ملی ہو تو وؔلی اورنگ آبادی سے آج تک پڑھ لیجیے۔ اگر اتنا وقت بھی مہیا نہ ہو تو ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ کی کتابوں کا مطالعہ زبان وادب کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وؔلی وسراؔج کی سرزمین کی لاج رکھنے والوں میں عصمت جاوید شیخ کا نام سرفہرست ہے۔

فنکار اکثر لاپروا اور لا ابالی ہوتے ہیں۔ ان سے تحقیق وتنقید، زبان وادب کے اسرار ورموز، لغت وغیرہ پر کوئی کام نہیں ہوتا۔ عصمت جاوید کا کمال یہی ہے کہ وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے اور اچھے شاعر بھی۔ ان کا شعری مجموعہ 'اکیلا درخت' اس بات کا ثبوت ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے۔ ایسی مثالیں کم ملتی ہیں۔ میں نے اکثر شاعروں کو دیکھا کہ وہ نثر کا ایک صفحہ مشکل سے لکھ پاتے ہیں اور تحقیق وتنقید انھیں بخار میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ 'اکیلا درخت' پر عالمانہ شاعری کے پکے پھل لٹک رہے ہیں۔ اس میں عربی فارسی کی نامانوس تراکیب سے شعوری احتراز کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ عصمت جاوید کی شاعری دل کی کم، دماغ کی زیادہ ہے۔ اس میں آمد کی سرگوشی کم اور آورد کا شور زیادہ سنائی دیتا ہے۔

اورنگ آباد دکن آ کر ادب میں سرخرو ہونے والوں کا سلسلہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے شروع ہو کر مجید بیدآر تک پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ اور ڈاکٹر مجید بیدآر میں بہت سی باتیں مشترک ہیں مثلاً دونوں اورنگ آباد کے نہیں ہیں۔ دونوں کا تعلق پونہ سے رہا ہے اور دونوں ریسرچ گائیڈ ہیں۔ دونوں نے صرف ذہین طلبہ کو پی ایچ ڈی کرنے دی۔ عصمت جاوید اور مجید بیدآر دونوں بخل کی حد تک کفایت شعار ہیں۔

شاہ حسین نہری کی پہلی کتاب 'شب آہنگ' کا پیش لفظ عصمت جاوید شیخ نے لکھا تھا۔ شاہ حسین نہری کو لگا کہ فن کے بارے میں جو بات ابتدا میں عصمت جاوید شیخ نے کہی تھی، درمیان میں اس کو غالباً رد کر رہے ہیں۔ بات سمجھنی چاہی تو عصمت جاوید نے غصّے میں ان کے ہاتھ سے کاغذات لے لیے اس لیے 'شب آہنگ' پیش لفظ کے بغیر شائع ہوئی لیکن شاہ حسین نہری نے کاتب کو دینے کے لیے اس پیش لفظ کی جو نقل لکھ رکھی تھی، وہ آج بھی محفوظ ہے۔ شاہ حسین نہری کا کہنا ہے کہ شیخ صاحب نے انتہائی شفقت، محبت اور اصرار سے مجھے کسی موضوع پر پی ایچ ڈی کر لینے کے لیے بارہا کہا۔

معین الدین عقیؔل اٹلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر اورنگ آباد آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہاں کس کس کو

جانتے ہیں تو ان کی زبان سے پہلا نام ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ کا نکلا۔ انھوں نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا، ''وہ گھر پر نہیں ملیں گے۔'' چوں کہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے کا دَور وظیفے کے بعد شروع ہوتا ہے اس لیے سروس کے دوران فرد بھول جاتا ہے کہ میں ریٹائر بھی ہوں گا اور ان دوستوں اور شناساؤں سے ملاقات کے لیے ترس جاؤں گا جن سے میں ملا کرتا تھا۔

'ڈاکٹر عصمت جاوید ... اپنے گھر میں' کے عنوان سے منوّر جہاں لکھتی ہیں: ''میرے شوہر جاوید ایک معصوم، سیدھے سادے، شریف النفس، نیک طبع، سنجیدہ اور وسیع القلب انسان تھے۔ انھوں نے میرے ساتھ زندگی بھر نیک برتاؤ کیا اور میرے کام کی بہت تعریف کرتے تھے۔'' آگے لکھتی ہیں: ''عصمت جاوید صاحب علم کا بہتا دریا تھے۔ وہ جو بھی مضمون لکھتے، ڈوب کر لکھتے تھے۔ اورنگ آباد میں انھوں نے پینتیس سال گزارے۔ اس درمیان انھوں نے جتنا سیکھا اس سے زیادہ پڑھایا۔ ان کا تخلیقی رجحان ابتدا ہی سے 'نمی رویم براہی کہ کارواں رفتہ است' کی طرح رہا۔ وہ قناعت پسند تھے لیکن حق کے حصول کے لیے کسی قسم کی مصالحت کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ وہ مجلسی آدمی نہیں تھے۔ بے حد کم گو اور بحث ومباحثے سے دور رہنے والے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کا قد اونچا کرنے کے لیے کسی بڑی شخصیت کو بیساکھی کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ وہ انشا پرداز، شاعر، نقاد، ماہر لسانیات، مترجم اور بہت اچھے معلم تھے۔ وہ کئی زبانوں کے ماہر تھے جن میں اُردو، فارسی، عربی، ہندی، مراٹھی اور انگریزی شامل ہیں۔''

پروفیسر عبدالستار دلوی اپنے مضمون 'ڈاکٹر عصمت جاوید کی ترجمہ نگاری اور زبان دانی' میں لکھتے ہیں: ''عصمت جاوید صاحب کا اورنگ آباد کے گورنمنٹ کالج میں تبادلہ روشنی کی کرن ثابت ہوا اور انھوں نے یہاں آ کر علمی فتوحات حاصل کیں۔ عصمت جاوید صاحب بہت اچھے شاعر تھے۔ مطالعہ وسیع تھا۔ تنقید سے دلچسپی تھی مگر زبان وبیان کے بارے میں ان کا طرزِ فکر روایتی تھا۔ وہ زبان کے تعلق سے جدید لسانیات کے اصولوں اور اندازِ فکر سے ہمیشہ مجھ سے اختلاف کرتے رہے۔ یوں بھی عمر میں مَیں ان سے چھوٹا تھا، اس لحاظ سے بھی مجھ سے اختلاف کرنا ان کے لیے جائز تھا۔ وہ صدرِ شعبہ تھے۔ اپنے جونیئرس کی باتوں سے اختلاف کرنا اور اپنے علم کا اظہار کرنا، ان کا مزاج تھا مگر آہستہ آہستہ انھوں نے بھی لسانیات پر چند بنیادی کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ ان کی لسانیات سے دلچسپی کا یہی پس منظر ہے۔ وہ اب مشرف بہ لسانیات ہو گئے ہیں۔''

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ کہتے ہیں کہ ان کی ذات سے ہر کسی کو فائدہ پہنچا۔ وہ اپنے آپ سے خود بھی مستفید ہوتے رہے۔ وہ ہر اس شخص سے رابطے میں رہے جس سے کام ہوتا اور جن سے کام نہ بھی ہوتا ہو۔ آخری زمانے میں بڑی مایوسی کی گفتگو کرتے تھے۔ زندگی کے آخری چند دن رہ گئے تھے۔ میں اور شاہ حسین نہری ان کی عیادت کے لیے گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر شاہ حسین نہری رونے لگے۔ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ انھوں نے بہت پُرسکون لہجے میں کہا، ''روئیے مت، روئیے مت۔ وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔''

ہم دونوں کچھ دیر پلنگ کے قریب بیٹھے۔ پھر بھاری دل اور وزنی قدموں سے لوٹ آئے۔ ان کے نئے مکان دلرس کالونی سے اپنے گھر تک کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ خدا جانے ہم کیا سوچ رہے تھے یا شاید ذہن سوچ اور فکر سے آزاد ہو گیا تھا۔

جو لوگ اس دارِ فانی سے چلے جاتے ہیں، وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ یاد آتے ہیں۔ عصمت جاوید شیخ جیسی شخصیت کو فراموش کرنا آسان نہیں۔ اُردو ادب کو تو اپنی بقا کے لیے انھیں ضرور یاد رکھنا چاہیے۔

معانی واشارات

استفادہ - نفع، فائدہ

لااُبالی - بےفکر، بے پروا

شریف النفس - شریف، نیک

نمی رویم براہی کہ کارواں رفتہ است - ہم اس راستے پر نہیں چلتے جس پر کارواں چلتا ہے۔

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو - لوگوں کے خیالات کو خدا کی طرف سے اعلان سمجھو۔

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

عارف خورشید کے افسانوں کے مجموعے

۲۔ سبق سے موزوں لفظ تلاش کر کے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

عصمت جاوید کا حلیہ

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ عصمت جاوید کا سراپا بیان کیجیے۔

۲۔ اُردو ادب کے مکمل مطالعے کے لیے مصنف کا مشورہ تحریر کیجیے۔

۳۔ شعرا کے بارے میں خاکہ نگار کی رائے کے بارے میں وضاحت سے لکھیے۔

۴۔ عصمت جاوید کے شعری مجموعے 'اکیلا درخت' پر مصنف کا تبصرہ قلم بند کیجیے۔

۵۔ 'شب آہنگ' کے پیش لفظ کے بغیر شائع ہونے کے سبب پر روشنی ڈالیے۔

۶۔ عصمت جاوید کے تعلق سے ان کی اہلیہ منوّر جہاں کے خیالات تحریر کیجیے۔

۷۔ عصمت جاوید اور عبد الستار دلوی کے تعلقات کے بارے میں لکھیے۔

* صحیح متبادل تلاش کر کے لکھیے۔

۱۔ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے کا دور وظیفے کے بعد شروع ہوتا ہے۔

(الف) دوستوں کو ملازمت کے دوران اہمیت نہ دینا۔

(ب) دوستوں کو فراموش کر دینا۔

(ج) ملاقات کے لیے ترسنا۔

(د) عبادت میں تنہائی ضروری سمجھنا۔

۲۔ "زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو"

(الف) عوام کی آواز کو دل کی آواز سمجھنا۔

(ب) عوام کی بات کو غیر اہم سمجھنا۔

(ج) عوام کی مخالفت کرنا۔

(د) عوام کے خیالات کو خدا کا اعلان سمجھنا۔

* درج ذیل جملوں کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

۱۔ 'اکیلا درخت' پر عالمانہ شاعری کے پکے پھل لٹک رہے ہیں۔

۲۔ انھوں نے اپنی شخصیت کا قد اونچا کرنے کے لیے کسی بڑی شخصیت کو بیساکھی کے طور پر استعمال نہیں کیا۔

۳۔ "روئیے مت، روئیے مت۔ وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔"

سرگرمی/منصوبہ :

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے بارے میں معلومات حاصل کر کے قلم بند کیجیے۔

۴

حدِّ یقیں سے حدِّ گماں تک

انور ظہیر خاں

جان پہچان

(۱) انور ظہیر خاں : انور ظہیر خاں ۲۲ جون ۱۹۵۴ء کو میرا نگر، ضلع سیتاپور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے آبائی وطن میں حاصل کی۔ بعد میں اپنے بڑے بھائی خان نصیب کے پاس ممبئ آ گئے اور ان کی سرپرستی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۸۶ء میں مہاراشٹر کالج کے شعبۂ اُردو میں بحیثیت لیکچرر ان کا تقرر ہوا۔ وہ ایک قابلِ رشک خاکہ نگار تھے۔ ابتدا میں انھوں نے کچھ تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ مہاراشٹر کالج، ممبئ کے سابق صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر محی رضا پر پہلا خاکہ لکھا۔ پھر اُردو ادب کے مشہور شعرا، اُدبا اور علمی شخصیتوں پر خاکے لکھے جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ اپنی کتاب 'مت سہل ہمیں جانو' کے لیے انھوں نے صرف سات خاکوں کو منتخب کیا۔ یہ کتاب ان کی پہلی اور آخری کتاب ثابت ہوئی۔ کالج میں ہونے والے مشاعروں کی نظامت کی وجہ سے وہ جن اُردو کے بڑے شعرا و ادبا سے قریب ہوئے، ان میں عزیز قیسی بھی تھے۔ اس جواں سال خاکہ نگار اور ادیب نے ۳/ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ممبئ میں اس دارِ فانی کو الوداع کہا۔

(۲) عزیز قیسی : عزیز محمد خان عرف عزیز قیسی یکم جولائی ۱۹۳۱ء کو حیدرآباد، تلنگانہ میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ انھوں نے خود کو ایک شاعر اور کہانی نویس کے طور پر منوایا۔ وہ اُردو کے شاعر، مصنف اور فلمی کہانی نویس تھے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آخر میں وہ ممبئ چلے آئے اور ممبئ کے ادبی اور فلمی منظرنامے کا ایک سرگرم حصہ بن گئے۔ اپنی زندگی کے اوائل میں وہ ترقی پسند مصنّفین کی تحریک سے وابستہ رہے۔ عزیز قیسی ۱۹۵۰ء کے وسط تک شاعری اور مختصر کہانیاں لکھ چکے تھے۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر ایک شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں لیکن انھوں نے نثر بھی لکھی ہے۔ ان کی شاعری غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں پر مشتمل ہے۔ ان کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات کا انگریزی کے ساتھ ساتھ دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان کا شمار اُن اہم شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو شاعری میں نمایاں کردار ادا کیا اور نئے رجحانات متعارف کروائے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۲ء کو ممبئ میں ان کا انتقال ہوا۔

عزیز قیسی مرحوم نے نوابوں کے شہر حیدرآباد اور تجارتی شہر ممبئ میں اپنی ساری عمر بسر کر دی۔ حیدرآباد کی دھرتی سے، وہاں کے کلچر سے انھیں لگاؤ تھا۔ ان کی زبان وہاں کی کھٹی دال، آم اور لیموں کے اچار، بریانی، کبابوں اور طرح طرح کی قابوں کا مزہ تلاش کرتی تھی اس لیے جب کبھی انھیں ذرا فراغت کے چند دن میسر آ جاتے، ہاتھ پیسوں کی گرمی محسوس کرتے تو وہ نینی تال یا کوڈی کنال کا نہیں موسیٰ ندی، مکہ مسجد، چار مینار اور سالار جنگ میوزیم والے حیدرآباد کا پھیرا کرتے۔ عزیزوں سے ملتے، یار دوستوں کے ساتھ شامیں سجاتے اور جب جیب ہلکی ہو جاتی تو گزرتے سمے کے چہرے پر اپنی بحثوں اور اپنے قہقہوں کے نشان چھوڑ کر چلے آتے۔ پھر وہی ممبئ کے شب و روز ہوتے، ملاقاتیں، باتیں اور گھاتیں ہوتیں۔ ممبئ میں معدے کی کلبلاہٹ، ظاہری ترک پھڑک کی پاسداری، فرد کو بستر سے پیٹھ لگانے کی مہلت ذرا کم ہی دیتی ہے۔ یہاں تسلسل اور ٹکراؤ ہے، آپا دھاپی ہے، جو گر گیا تو اس کا عمر بھر سنبھلنا محال ہے۔

ظاہر ہے جہاں رات دن ریاکاری، بے یقینی، بے اطمینانی سے واسطہ ہو، جہاں اہلِ علم وقلم، اہلِ ہنر کو لعینوں اور ہرزہ گویوں کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنا پڑے، جہاں انسانی ضمیر کی آواز پیسوں کی کھنک میں دبا دی جاتی ہو، بھلا وہاں جاگتی آنکھوں کا، جاگتے ضمیر کا آدمی کیسے خوش رہ سکتا ہے؟

یاد نہیں پڑتا، عزیز قیسی مرحوم کو کب دیکھا تھا، کہاں دیکھا تھا۔ کسے دوش دوں؟ اپنی نظر کے زاویے کو، حافظے کو یا مرحوم کے نقشِ اوّل کو جو گہرا اور دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ دل یہ کہہ رہا ہے کہ ادیبوں اور ادب نوازوں کے جلو اور جلوس میں دیکھا ہوگا کیونکہ انھیں جب کبھی دور ونزدیک سے دیکھا تو کسی جلسے مشاعرے میں، کسی سیمینار یا ادبی محفل میں کلام سناتے، تبصرہ یا تنقید کرتے ہوئے دیکھا۔

عزیز قیسی نہ گلے باز تھے نہ مشاعرہ باز۔ وہ مخصوص نشستوں کے، ادیبوں شاعروں کے جمگھٹے کے آدمی تھے، عوامی اسٹیج کے نہیں۔ انھیں عام مشاعروں کی طرح کلام سنانے کا کچھ زیادہ ہوکا نہیں تھا۔ وقفہ دے دے کر نظمیں غزلیں کہتے پر بے موقع، بلافرمائش نہیں سناتے تھے۔ آواز بوجھل تھی اور گلا بھی رُندھا ہوا تھا کہ جیسے دل سے قیامت گزر گئی ہو۔ گویا میر کے اس شعر کی تفسیر ۔

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

نام عزیز محمد خاں تھا۔ ماں سیّدانی تھیں، باپ مفلس مگر غیور پٹھان تھے۔ گھر سات بھائیوں اور ایک بہن سے بھرا پُرا تھا۔ لڑکپن غریبی میں بسر ہوا۔ ذہانت مادری اور پدری تھی۔ رگوں میں پٹھانی خون ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ ہڈیاں افغانوں کی طرح چوڑی چکلی، گوشت کی چٹانیں چوٹی سے ایڑی تک ہاڑ پر دھری ہوئی تھیں، قد ایوریسٹ سے کم نہ تھا۔ رنگ میلے سونے کی طرح، چہرہ گول اور بڑا، گال متناسب، جن میں ہنستے وقت گڑھے پڑ جاتے تھے۔ سر کا پیالہ بالوں سے ڈھکا ہوا، گردن پہلوانی تھی، ماتھا چوڑا اور سلوٹوں سے پُر، بال دست بردِ زمانہ سے محفوظ، گھنگھریالے اور تِل چاوٗلے تھے۔ ناک اونچی اور نتھنے پھولے ہوئے، ناک پر کالے فریم کی موٹے موٹے شیشوں کی عینک دھری ہوئی، آنکھیں شیشوں کے پیچھے سے ذہانت کا اعلان کرتی ہوئیں، موٹے موٹے ہونٹ، ڈاڑھی مونچھ کا نام ونشان نہیں۔ لہجے میں ٹھہراؤ، بھرے بھرے کندھے۔ اکثر پینٹ اور کبھی کبھی پاجامہ پہنتے، گلے میں پوری آستین کا بش شرٹ یا کرتا ڈالے ہوتے اور پیروں میں سستے یا اوسط داموں کے چپل۔ کسی دور میں شیروانی بھی پہنا کرتے تھے جب آتش جوان تھا۔ واقعی ان کے جثّہ پر شیروانی کی پھبن دلوں میں لگن اور چبھن پیدا کردیتی ہوگی۔ چال درمیانہ اور وضع قلندرانہ تھی۔ عمر بھر قلم کا ہل چلایا۔ گیت، غزلیں، نظمیں، کہانی، مکالمے، سینیریو لکھ کر کمایا۔ کمایا اتنا ہی کہ گھر کی سفیدی اور لباس کے اُجلے پن پر داغ دھبے نہ دِکھائی دیں۔ اُردو کا یہی نصیب ہے، ہر کوئی نہ ساحرؔ ہوسکتا ہے نہ ابنِ صفی اور نہ حفیظؔ جالندھری۔

عزیز قیسی آخری سانس تک اُردو کے نوالۂ خشک وتر میں مست رہے اور ممبئی کے بارے میں کہتے رہے، ''روزی رساں ہے شہر۔'' وہ حیدرآباد کی خاک سے اُٹھے، مخدومؔ کے تیور دیکھے، سلیمان اَریبؔ کی صحبتیں اُٹھائیں، شاذؔ تمکنت اور نہ جانے کتنے دوستوں کے ساتھ گلیوں اور گلیاروں، کوچوں اور چوراہوں تک، ریستورانوں، پان کی دکانوں تک خوب خوب خاک چھانی۔ عدالت میں نہ چاہتے ہوئے چار سال ملازمت کی۔ زندگی کی کٹھنائیوں اور مطالعے کی میز سے جو کچھ ہاتھ لگا، ان سب کو ہم آہنگ کرکے ایک ناول، دسیوں افسانے اور دو شعری مجموعے 'آئینہ در آئینہ' اور 'گرد باد' کے نام سے دے گئے مگر زندہ رہیں گے صرف اپنی نظموں اور غزلوں کی بدولت۔

انھیں تکلّف، تصنّع اور ڈراما بازی سے چڑتھی۔ اپنے سے بڑوں کو بھی روکنے ٹوکنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس تعلق سے ایک واقعہ یاد آیا کہ مہاراشٹر اُردو اکادمی نے ایک ادبی محفل کا انعقاد کیا تھا۔ غالبًا اس کے کنو ینز ڈاکٹر ظ. انصاری تھے۔ وہ منظر اب تک آنکھوں میں تر و تازہ ہے۔ ظ. انصاری مرحوم پُشکِن کی چند نظموں کا منظوم ترجمہ نذرِ سامعین کرتے ہیں۔ ایک تو طول طویل نظمیں، دوسرے مرحوم کا اندازِ پیش کش کہ مصرعوں کو بار بار دہراتے ہیں، آواز میں زیر و بم پیدا کرتے ہیں، آنکھیں نچاتے اور ہاتھوں کو ہلاتے ہیں۔ یہ سارا منظر دیکھ کر سامعین میں سے بعض مرعوب و متاثر بھی ہورہے ہیں، کچھ لوگ دل میں ان کی اداؤں کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ عزیز قیسی یہ دیکھ دیکھ کر پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ ظ. انصاری نے جب جی بھر کر سنا لیا تو کاغذات سمیٹ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔ اس کے بعد منظر بدلا۔ عزیز قیسی آہستہ آہستہ کرسی سے اپنے آپ کو الگ کرتے ہیں، ہولے ہولے چل کر پوڈیم تک پہنچتے ہیں، حاضرین پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ظ. انصاری کی آنکھوں سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گویا ہوتے ہیں:

''حضرات! یہ ظ. انصاری صاحب جو نہ کریں تھوڑا ہے۔'' (سامعین کے زوردار قہقہے بلند ہوتے ہیں) کچھ توقف کر کے کہتے ہیں، ''یہ پُشکِن کی شاعری ہے۔ ترجمہ نگار نے دیدہ ریزی اور تندہی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ زبان کی چٹک مٹک بھی ہے جو ظ. انصاری صاحب کا خاص انداز ہے۔ لگتا ہے روسی ادب کے ان شاہکاروں کو اُردو میں ڈھالتے وقت میر حسؔن، دیا شنکر نسیؔم اور مرزا شوقؔ کے فنی شاہکار مترجم کے سامنے رہے ہیں۔ اس وقت یہاں سوائے ظ. صاحب کے کوئی بھی روسی زبان و ادب کا پارکھ نہیں ہے۔ سو ہم کیسے یقین کریں کہ ترجمہ نگاری کے تمام لوازمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ظ. صاحب اس بھاری پتھر کو اُٹھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ نظمیں ظ. انصاری صاحب کو ان حضرات کے درمیان سنانی چاہئیں کہ جہاں روسی اور اُردو دونوں زبانوں کے مزاج داں موجود ہوں۔''

عزیز قیسی نے غلط کچھ نہیں کہا تھا لیکن بغلی گھونسے مارنے کے انداز میں کہا تھا اور ظ. صاحب کراہ رہے تھے۔ وہ مری مری آواز میں آہستہ آہستہ صرف اتنا بولے، ''ہاں بھئی، اس حقیر زبان کے حقیر ادیب کو دیدے ٹپکانے اور خون پسینہ ایک کرنے کا صلہ صفر کی صورت ہی میں ملتا ہے۔''

اتوار کی شام ہے۔ مقدر حمید صاحب کے فلیٹ پر ایک بےتکلّف ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا ہے۔ عزیز قیسی صاحب سریندر پرکاش جی کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ اب باقاعدہ نشست شروع ہوتی ہے۔ بحث کا آغاز انور قمر کرتے ہیں۔ شرکائے بزم بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں مگر عزیز قیسی صاحب کی رائے وزنی اور قطعی ہوتی ہے۔ یاد نہیں کس کی نظم یا افسانے میں غزوۂ تبوک کا ذکر تھا۔ عزیز قیسی محاکمہ تو کرتے ہیں لیکن تلمیح کی جانب کوئی اشارہ نہیں کرتے۔ مشتاق مومن چھیڑتے ہوئے کہتے ہیں، ''جناب، آپ نہیں جانتے، یہ تلمیح ہے اس کے حوالے سے بات کیجیے۔''

اس کے بعد عزیز قیسی کے اندر کا ضدی مگر ذہین پٹھان انگڑائیاں لے کر بیدار ہوجاتا ہے اور اپنی نظر اور خبر، تنقیدی بصارت و بصیرت اور حافظے کا وہ زور دِکھاتا ہے کہ زیر بحث موضوع کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا۔ ہم میں سے ہر شخص دم بہ خود رہ گیا اور مشتاق مومن کو کاٹو تو خون نہیں۔ اس روز انھوں نے ثابت کیا کہ واقعی ان کی ذہانت فطری ہے اور موروثی بھی۔ ان کے کہنے کے مطابق یقیناً انھوں نے نو سال کی عمر میں قرآن مع ترجمہ پڑھا ہوگا۔ تیرھویں سال میں تجوید و تفسیر قرآن ختم کرلیا ہوگا۔ بہر حال ان کا مطالعہ وسیع اور تجربہ کڑا تھا۔ شعری و ادبی ذوق رچا اور پچا ہوا تھا۔ اپنے مطالعے کی کھٹی ڈکار لیتے نظر نہ آتے تھے مگر چھیڑنے پر ان

کے ہاں جوار بھاٹا آجاتا تھا۔

انتقال سے چار مہینے پہلے کینسر کے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بہتیرا علاج معالجہ کیا لیکن افاقہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ اندر سے گھلتے رہے۔ غرض، مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اُردو اکادمی کی بورڈ میٹنگ میں سردار جعفری صاحب نے تجویز رکھی، ''عزیز قیسی نے عمر بھر اُردو کی خدمت کی ہے۔ اِن دِنوں مرض الموت کا شکار ہیں۔ اُردو اکادمی کا فریضہ ٹھہرتا ہے کہ ہم ان کے لیے طبّی امداد کے طور پر پچیس ہزار روپے منظور کریں۔'' اراکینِ اکادمی نے تجویز کی تائید کی۔ چیئرمین اُردو اکادمی پروفیسر جاوید خان صاحب نے اسے منظور کیا۔ حکومت کے منٹوں اور گھنٹوں کے کام ہفتوں عشروں میں کیا، مہینوں بلکہ برسوں میں ہوتے ہیں۔ جعفری صاحب برابر ہدایت کرتے رہے کہ چیک جلد از جلد عزیز قیسی کو پہنچایا جائے۔ یوسف ناظم صاحب اس سلسلے میں برابر فون کھڑکھڑاتے رہے۔ چیک تیار ہوا تو میں نے یوسف ناظم صاحب کو فون کیا، ''حضور، چیک بن گیا ہے۔''

انھوں نے کہا، ''تو میں وصول کرنے آتا ہوں۔''

میں نے کہا، ''آپ کیوں زحمت کریں گے، میں خود انھیں جسلوک اسپتال جا کر دے دیتا ہوں۔''

میں ان کی عیادت کے لیے جسلوک اسپتال پہنچا۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی جی دھک سے رہ گیا کہ اب بچا ہی کیا ہے۔ چنگاریاں بجھ چکی ہیں، بس راکھ ہی راکھ ہے اور ہلکی سی حرارت کوئی دم کی مہمان ہے۔ بیڈ کے قریب پہنچ کر آداب کیا۔ انھوں نے اپنی نظروں کی کمند میرے چہرے پر پھینکتے ہوئے جواباً سر کو جنبش دی۔ میں نے مزاج پرسی کی تو بناوٹی ہنسی جس میں جانے کتنے زمانوں کا کرب تھا، ہونٹوں پر سجاتے ہوئے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر گویا ہوئے، ''انور ظہیر صاحب! حالت تو آپ دیکھ رہے ہیں مگر میں ابھی زندگی سے مایوس نہیں ہوں۔ میں پٹھان کا بچہ ہوں، موت کو آسانی سے حاوی نہیں ہونے دوں گا۔''

میں نے انھیں چیک تھماتے ہوئے کہا، ''ابھی آپ کو زندہ رہنا ہے۔ ڈھیر سارا کام کرنا ہے۔''

ہنسے ... گو ہنسنا منع تھا۔ کہنے لگے، ''بڑے موقع سے آپ چیک لے آئے۔ اسے فوراً کیش کرا کر یہاں کا بل ادا کر کے حیدرآباد چلا جاؤں گا۔ ہم وطنوں، دوستوں، عزیزوں کی خواہش بھی ہے۔ وہاں علاج ہوگا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔ جن جن سے قرض لینا تھا لے چکا ہوں۔ زندگی بھر اکادمی سے کوئی گرانٹ نہیں لی۔ آج یہ دن بھی دیکھنا پڑ رہا ہے۔''

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ لگا کہ کراں تا کراں خلا ہی خلا ہے جہاں باضمیری اور خودداری کا پنچھی پھڑپھڑا رہا ہے۔ میں نے ان کی دلجوئی کی خاطر عرض کیا، ''قیسی صاحب! یہ تو اکادمی کا فرض تھا جو اس نے نبھایا۔''

وہ سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیسا پہاڑ جیسا بدن برف کی سل کی طرح ہر مرتی ہوئی ساعت کے ساتھ پگھل رہا ہے۔ کل ہوا ہو جائے گا۔ جس کے تذکرے اور کارنامے کتابوں میں ملیں گے۔ رخصت کی اجازت چاہی تو کہا، ''بہتر ہے۔ حیدرآباد سے واپسی پر ملاقات ہوگی۔''

وہ گئے اور مہینے بھر کے اندر واپس آ گئے اور دو ہی چار روز میں یہ خاکی آدمی سپردِ خاک ہو گیا۔ سچ ہے ؎

حدِّ یقیں سے حدِّ گماں تک
سایے سایے سایے ہیں

معانی واشارات

قاب	رکابی	تل چاولے	سیاہ وسفید
ٹسل	ٹکراؤ	کلبۂ افلاس	جھونپڑی
ہرزہ گو	نامعقول بات کرنے والا	غالی	جھوٹا
ہوکا	لالچ	محاکمہ	تجزیہ

مشقی سرگرمیاں

* خاکے پر مبنی سرگرمیاں

۱۔ جان پہچان سے موزوں لفظ تلاش کرکے شبکی خاکہ مکمل کیجیے۔

انور ظہیر خاں

تاریخ پیدائش	مقام پیدائش

ملازمت	تاریخ وفات

۲۔ سبق سے موزوں لفظ تلاش کرکے خاکہ مکمل کیجیے۔

حیدرآباد کے پکوان

۳۔ سبق سے موزوں لفظ تلاش کرکے خاکہ مکمل کیجیے۔

حیدرآباد کے مشہور مقامات

* چوکون مکمل کیجیے۔

ہڈیاں	
رنگ	
چہرہ	
گال	

* ہدایات کے مطابق درج ذیل سرگرمیاں مکمل کیجیے۔

۱۔ شہر حیدرآباد سے عزیز قیسی کو جو لگاؤ تھا اُسے تحریر کیجیے۔

۲۔ سبق میں مذکور ممبئی کا منظرنامہ بیان کیجیے۔

۳۔ حیدرآباد کی خاک سے اُٹھے دو مشہور شعرا کے نام لکھیے۔

۴۔ سبق میں مذکور ظ. انصاری صاحب کی ترجمہ نگاری پر عزیز قیسی کا تبصرہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۵۔ وہ واقعہ بیان کیجیے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عزیز قیسی کی ذہانت فطری تھی اور موروثی بھی۔

۶۔ سبق کی روشنی میں عزیز قیسی کی شاعری کے بارے میں لکھیے۔

* درج ذیل جملے کی استحسانی وضاحت کیجیے۔

ہاں بھئی اس حقیر زبان کے حقیر ادیب کو دیدے ٹپکانے اور خون پسینہ ایک کرنے کا صلہ صفر کی صورت ہی میں ملتا ہے۔

* ہدایت کے مطابق درج ذیل قواعدی سرگرمی مکمل کیجیے۔

سبق سے چار محاورے تلاش کیجیے اور ان کے معنی لکھیے۔

سرگرمی/منصوبہ :

۱۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے متعلق معلومات حاصل کرکے لکھیے۔

۲۔ انور ظہیر خاں کی خاکوں پر مشتمل کتاب 'مت سہل ہمیں جانو' حاصل کرکے اُس کا مطالعہ کیجیے۔

اطلاقی تحریر

۱ انٹرویو (مصاحبہ)

تمہید

ہم اخباروں، رسالوں، ریڈیو، ٹیلی وِژن وغیرہ پر 'انٹرویو' کے نام سے کچھ لوگوں کی گفتگو کو سنتے اور دیکھتے رہتے ہیں۔ جلسے جلوس اور ثقافتی پروگرام میں بھی انٹرویو لیے جاتے ہیں۔ ایسے انٹرویو کے ذریعے کسی شخص کی زندگی اور اس کی کارکردگی کے متعلق معلومات حاصل کی جاتی ہے۔ انٹرویو لینا اور دینا نہایت مہارت کا کام ہے۔ آج کل ملاقات یا انٹرویو کو بڑے پیمانے پر پیشہ ورانہ اہمیت حاصل ہورہی ہے۔ اس لیے انٹرویو کی پیشگی تیاری کیسے کریں، انٹرویو کیسے لیں، ملازمت کے لیے، کسی بھی قسم کے کورس میں داخلے کے لیے انٹرویو کیسے دیں، اس وقت کون سی احتیاط برتیں جیسے کچھ نکات کی معلومات ہمیں ہونی چاہیے۔

ہیئت

انٹرویو یعنی مکالمہ یا مصاحبہ۔ یہ مکالمہ منصوبہ بند ہوتا ہے اور اسے ایک مقصد کے تحت مکمل کیا جاتا ہے۔ انٹرویو دینے والے، انٹرویو لینے والے اور سننے، دیکھنے اور پڑھنے والوں کی شمولیت سے انٹرویو مکمل ہوتا ہے۔ اس میں ترتیب وار سوال جواب کے ذریعے ایک شخص دوسرے شخص کی زندگی اور اس کی کارکردگی ناظرین کے سامنے آشکار کرتا ہے، اس وقت ان کے درمیان ہونے والا مکالمہ ہی انٹرویو کہلاتا ہے۔ ارادتاً کیے جانے والے نظریاتی مکالمے یعنی انٹرویو کے لیے شخصیت، دن، وقت، مقام، موضوع، مدت، مقاصد وغیرہ امور پہلے سے طے کر لیے جاتے ہیں۔

انٹرویو کی مختلف قسمیں ہیں۔ ایک وقت میں ایک شخص دوسرے شخص سے انٹرویو لے سکتا ہے۔ اسی طرح ایک وقت میں ایک شخص کئی لوگوں سے انٹرویو لے سکتا ہے۔ فون پر بھی انٹرویو لیا جاسکتا ہے۔

انٹرویو تحریری، زبانی، ریکارڈ کر کے اور بالمشافہ گفتگو پر مشتمل ہوتا ہے۔ انٹرویو خیالات کو وسعت دینے والے، جذبات پر مبنی، سامعین کی دلچسپی اور تجسّس پر مبنی، کسی موضوع کے تمام پہلوؤں کو واضح کرنے والے، تجربات بتانے والے، ادب کی خوب صورتی کو آشکار کرنے والے، آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرنے والے، اس طرح مختلف اقسام کے انٹرویو ہوتے ہیں۔

جن کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہو اور جن کے پاس سننے کے لیے کچھ ہو، ایسے ہی افراد کا انٹرویو لیا جاسکتا ہے۔ یہ افراد عوامی نمائندے، فنکار، کھلاڑی، سائنس داں، ڈاکٹر، اساتذہ ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح پیشہ ور، کاروباری، وکیل، ماہر، ٹیکنیشین، مصنف، شاعر، کوہ پیما، مدیر، معمر شہری، فوجی، پائلٹ، انعام یافتہ شخصیت، مفکر، زرعی مزدور، مزدور اور پھیری والے بھی اس کا حصہ بن سکتے ہیں۔ عام طور پر ایسے ذمے دار افراد جنھوں نے اپنے شعبوں میں اپنی چھاپ چھوڑی ہے، جنھوں نے دنیا سے ہٹ کر چیلنج قبول کر کے غیر معمولی کام انجام دیے ہیں اور جنھیں معاشرے میں خاص احترام اور خاص مقام حاصل ہے، ایسے کئی لوگوں سے انٹرویو لیا جاسکتا ہے۔ عام

آدمی سے بھی انٹرویولیا جاسکتا ہے۔شرط یہ ہے کہ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ انوکھی باتیں ہوں۔

مقصد

انٹرویو کے کئی مقاصد ہوتے ہیں۔انٹرویو دینے والی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے، نیز اس کی کارکردگی پر روشنی ڈالنے کے لیے انٹرویولیا جاسکتا ہے۔کئی لوگوں کی زندگیاں جدوجہد سے عبارت ہوتی ہیں۔عوام کے دلوں میں اس جدوجہد کو جاننے کی خواہش ہوتی ہے،جس کے لیے انٹرویولیا جاسکتا ہے۔فرد کی کارکردگی کے ساتھ اس فرد کے اندرون پوشیدہ 'شخصیت' کو سمجھنے کے لیے خاص طور پر انٹرویولیا جاتا ہے۔مختلف موضوعات پر مفکرین کی رائے جاننے،کسی ماہر شخص سے کچھ نئی معلومات حاصل کرنے،کسی واقعے کی گہرائی جاننے کے لیے انٹرویو کا انعقاد کیا جاتا ہے۔انٹرویو دینے والا شخص جس ماحول میں پروان چڑھا،اس کو سمجھنے کے لیے،معاشرے میں انقلاب لانے،عوامی بیداری اور فنون کے استحسان کے لیے انٹرویو لیے جاتے ہیں۔

انٹرویو کی پیشگی تیاری

کامیاب انٹرویو کے لیے پیشگی تیاری لازمی ہے جو کامیاب انٹرویو کی بنیاد ہے۔سب سے اہم پیشگی تیاری یہ کہ جس فرد کا انٹرویو لینا ہے،اس کے تعلق سے ضروری معلومات انٹرویو لینے والے کے پاس پہلے سے موجود ہونا چاہیے مثلاً اس کا پورا نام،قلمی نام، عمر، تاریخِ پیدائش، مقامِ پیدائش، پتا،تعلیم، خاندانی معلومات، کارکردگی،موجودہ عہدہ، حاصل شدہ انعامات و اعزازات، تصانیف، نظریات کا پس منظر وغیرہ۔انٹرویو لینے والے کو انٹرویو کے تعلق سے گہرا مطالعہ کرکے رکھنا چاہیے۔انٹرویو کا مقصد بھی اچھی طرح سے جان لینا چاہیے۔اس کے بعد اس موضوع اور مقصد کو ذہن میں رکھ کر عملی انٹرویو کے لیے پوچھے جانے والے سوالات تیار کرنے چاہئیں۔انٹرویو کے لیے کتنا وقت درکار ہوگا،اسے ذہن میں رکھ کر اس کے مطابق سوالوں کی تعداد کا تعین کرنا چاہیے۔انٹرویو کے سوالات مناسب ترتیب میں ہونے چاہئیں۔

اصل میں انٹرویو کی نوعیت کیا ہے، وہ بالمشافہ ہونے والا ہے یا تحریری شکل میں، ناظر یا سامع کون ہوں گے (طلبہ، مجموعی طور پر طلبہ اور سرپرست،صرف عام شہری یا صرف خواتین وغیرہ) یہ تمام معلومات انٹرویو لینے والے کو حاصل کرکے رکھنا چاہیے۔اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ انٹرویو راست ناظرین کے سامنے ہے، ریڈیو کے لیے ہے یا ٹیلی وژن کے لیے۔انٹرویو کے لیے نشست کا انتظام، ریکارڈنگ کا انتظام، سازگار ماحول،حسبِ ضرورت حوالہ جاتی کتب، تصاویر، موسیقی کے آلات وغیرہ امور کا پہلے ہی سے خیال رکھنا مناسب ہوتا ہے۔ضرورت ہو تو انٹرویو دینے والے سے پہلے ہی ملاقات کرکے بات چیت کرلی جائے جس سے انٹرویو لینا آسان ہوجاتا ہے۔آکاش وانی، ٹیلی وژن پر، اسی طرح روبرو لیے گئے انٹرویو سننے سے انٹرویو کی پیشگی تیاری کے لیے راہ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

انٹرویو کس طرح لیا جائے:

• انٹرویو کا تمہیدی مرحلہ

انٹرویو کی ابتدا نہایت دلچسپ، مزیدار اور راست ناظرین/ قارئین کے دل کو چھونے والی ہونی چاہیے۔ انٹرویو لینے والے کے پہلے چار چھے جملے ایسے ہوں کہ سامعین/ قارئین سننے/ پڑھنے میں محو ہو جائیں۔ 'Well begun is half done' اسی لیے کہا جاتا ہے۔

میچ کی پہلی ہی گیند پر کسی بلّے باز کے ذریعے گیند کو باؤنڈری لائن کے پار کرا دینے سے جو خوشی کا احساس ہوتا ہے اسی طرح انٹرویو بھی خالص فطری انداز میں، آسانی سے، رواں دواں ہونا چاہیے۔ اس میں ذرا بھی مصنوعی انداز نہ آنے پائے جس کے لیے انٹرویو لینے والے کو انٹرویو دینے والے کے مزاج اور فطرت سے مکمل واقفیت حاصل ہونا ضروری ہے۔ ایک آدھ چٹکلا، تازہ واقعہ سنا کر اس کے آخر میں اتنا ہی اہم اور چبھتا ہوا سوال گیند کی طرح آغاز ہی میں انٹرویو دینے والے کے پالے میں پھینکا جا سکتا ہے۔

انٹرویو کی ابتدا ہلکے پھلکے سوالوں سے ہو تاکہ ماحول خوش گوار رہے۔ انٹرویو کا آغاز جتنا رواں دواں ہوگا، آگے کی محفل زیادہ سے زیادہ پُر لطف ہوتی چلی جائے گی۔ انٹرویو لینے والے کی خود اعتمادی دوگنی ہو جائے گی۔ انٹرویو دینے والا کھل کر سامنے آئے گا اور سامعین/ قارئین اس انٹرویو سے خوب لطف اُٹھائیں گے۔

• انٹرویو کا درمیانی مرحلہ

چلیے! آغاز تو ہوا۔ اب حقیقی بلے بازی کی ابتدا ہوتی ہے۔ سوالوں کی فہرست تو سامنے ہے ہی، ان کی ترتیب بھی درست ہے۔ جواب کیا ملیں گے یہ غیر یقینی ہے۔ چنانچہ ایک سوال، پھر اس کا مکمل جواب، پھر دوسرا سوال، اس کا مکمل جواب، تیسرا، چوتھا... اس ترتیب سے بڑھتے جائیں تو انٹرویو خشک اور بے لطف ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس لیے سوال ہی ایسے لچک دار تیار کریں کہ حاصل ہونے والے جوابوں کی ڈور پکڑ کر اگلے سوال تک پہنچنا آسان ہو جائے۔ اسی کا نام مہارت ہے اور یہ فی البدیہہ اظہارِ خیال کی صلاحیت کی ورزش بھی ہے جو صرف مشق سے حاصل ہوتی ہے۔ سوالوں کی فہرست انٹرویو لینے والے کے لیے ہوتی ہے، سامعین کے لیے نہیں۔

سوالوں کے رنگ برنگی پھول ایک کے بعد ایک انٹرویو کی ڈور میں پروتے جائیں تو وہ ایک مسلسل ذہنی مکالمے کا ہار بن جاتا ہے۔ سوالوں سے جواب، جوابوں سے سوال، سوالوں کے جواب، جوابوں کے سوال ... دیکھتے دیکھتے انٹرویو دینے والے کی شخصیت کے پہلو اُجاگر ہوتے جاتے ہیں۔ اس مرحلے میں اصل موضوع سے ہٹنے سے بچا جائے۔ انٹرویو کے مقصد سے دور نہ جایا جائے۔ انٹرویو مزاح سے پُر ہو لیکن مزاح میں گم ہو کر انٹرویو کے مقصد سے نہ بھٹکیں۔

جس طرح سورج کی کرنوں کے لمس سے کلی کی ایک ایک پنکھڑی کھل کر خوش نما پھول میں تبدیل ہوتی ہے، اسی طرح سوال پوچھنے والا ایک ایک سوال کے ذریعے انٹرویو دینے والے کی شخصیت اور اس کی کارکردگی اُجاگر کرتا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ انٹرویو نقطۂ عروج کی جانب گامزن رہتا ہے۔ موضوع، شخصیت اور نظریات کے پہلو سامنے آتے جاتے ہیں۔ اسی طرح انٹرویو کے اس

مرحلے پر انٹرویو لینے والا انٹرویو دینے والے کو زیادہ سے زیادہ وقت دے تاکہ اسے زیادہ کھلنے کا موقع ملے۔ سوال اس طریقے سے پوچھے جائیں کہ جواب دینے والے کا جوش بڑھتا جائے۔

اسی مرحلے پر پورے انٹرویو کے سب سے اہم اور موضوع سے براہِ راست تعلق رکھنے والے سوال پوچھیں۔ انٹرویو کے ذریعے لوگوں کو جو پیغام دینا ہے وہ اسی مرحلے میں دینا ہے۔

• انٹرویو کا اختتامی مرحلہ

اب تک کا وقت بہت خوش گوار گزرا لیکن اب کہیں تو ٹھہرنا ہے۔ مگر اس نکتے پر ٹھہراؤ کا مطلب انٹرویو بامِ عروج پر ہونا چاہیے۔ یہاں انٹرویو لینے والے کو اپنی زبان دانی کی مکمل مہارت کو مربوط کرلینا ہوتا ہے۔ اختتام ایسا کرنا ہوتا ہے کہ سامعین / ناظرین محسوس کریں کہ ''ارے! انٹرویو تو بہت جلد ختم ہوگیا۔'' اختتامی مرحلے پر انٹرویو لینے والا خود کے لیے کچھ زیادہ وقت رکھے تو کوئی ہرج نہیں۔ سوالوں کی بجائے نتیجہ خیز اور پُراثر گزارش کرنا اس مرحلے پر زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

انٹرویو مناسب وقت اور مناسب مقام پر ختم کریں۔ مناسب وقت کیا ہوسکتا ہے؟ مناسب وقت وہ ہوتا ہے جب سامعین کو بالکل بھی اندازہ نہ ہو کہ انٹرویو ختم ہوسکتا ہے۔ یعنی غیر متوقع طور پر اور تجسّس کو برقرار رکھتے ہوئے ختم کریں۔ خیال رہے کہ انٹرویو نامکمل یا ادھورا نہ لگے۔ سامعین کا مکمل اطمینان لازمی ہے۔ سامعین یہ محسوس کریں کہ ''اور کچھ دیر یہ انٹرویو اسی طرح جاری رہتا تو اچھا ہوتا۔'' اس طرح کا اختتام عمدہ اختتام ہوتا ہے۔ انٹرویو سننے والے اگر انٹرویو کے کچھ مکالمے بطور یادگار اپنے ساتھ لے گئے تو سمجھیے کہ انٹرویو کامیاب رہا۔

ملازمت یا کسی کورس میں داخلے کے لیے انٹرویو

ملازمت یا کسی کورس میں داخلے کے لیے اب تک جس قسم کے انٹرویو لیے جاتے رہے ہیں ان میں تیزی سے تبدیلیاں آنے لگی ہیں۔ اُمیدوار کی ذہنی استعداد، اس کی معلومات کی سطح، اس کا میلان وغیرہ تو پہلے کی طرح آج بھی انٹرویو میں جانچے جاتے ہیں لیکن اس سے بڑھ کر اب زور دیا جاتا ہے اُمیدوار کی شخصیت کی قدر پیمائی پر، اس کے برتاؤ پر۔ اب صرف ملازمت کے لیے ہی نہیں بلکہ زندگی سے متعلق نظریات جانچنے کا زمانہ آ گیا ہے۔ اب اُمیدوار سے مختلف توقعات کی جاتی ہیں : اس کی ذہنی استعداد، تکنیکی معلومات، قوتِ فیصلہ، زبان پر عبور، اس کی نشست و برخاست، لباس، نیز 'کیا آپ اس مقابلے میں قائم رہ سکیں گے، کیا آپ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرسکتے ہیں، آپ کہاں تک اپنی کامیابی کا سہرا ٹیم کے دیگر افراد کے سر باندھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، دوسروں کے خیالات، جذبات اور ہدایات قبول کرنے کی آپ میں کتنی صلاحیت ہے'، یہ اور اس طرح کی باتیں آج کل انٹرویو کے وقت زیادہ سے زیادہ اہمیت دے کر جانچی پرکھی جاتی ہیں۔ اُمیدوار باہر کی دنیا کی بجائے اپنے اندرون میں کتنا ترقی یافتہ ہوچکا ہے، یہ جاننا آج کل کے انٹرویو کا خاصہ ہے۔

انٹرویو لیتے وقت 'یہ' ضرور کریں:

- انٹرویو لینے والا اپنی حدود کا خیال رکھتے ہوئے سوال پوچھے۔
- سوالوں کے جواب دینے یا نہ دینے کی آزادی انٹرویو دینے والے کو دی جائے۔
- انٹرویو کا انداز رواں، آسانی سے سنا جا سکے اور جوش و جذبے سے پُر ہو۔
- انٹرویو کے درمیان بے تکلفی اور سازگار ماحول بنا رہے۔
- 'ہاں، نہیں، معلوم نہیں، بعد میں کہوں گا' جیسے جواب موصول نہ ہوں، اس بات کو ذہن میں رکھ کر سوال بنائے گئے ہوں۔
- اطمینان سے، جوش و جذبے پر قابو اور اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے خوش دلی کے ساتھ انٹرویو میں دلچسپی برقرار رکھی جائے۔

انٹرویو لیتے وقت ان باتوں کی احتیاط برتیں:

- غلط اور ناموزوں سوال پوچھنے سے گریز کریں۔
- سوال پوچھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ انٹرویو دینے والے کی بے عزّتی نہ ہو۔
- ایسے سوالوں سے اجتناب برتیں جن سے کشیدگی اور اختلاف کا ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔
- بنیادی موضوع سے ہٹ کر غیر ضروری سوال نہ کریں۔
- متوقع قیاسی جواب ملیں، قیاس پر مبنی ایسے سوال نہ کریں۔
- پیچیدہ اور مشکل سوال نہ کریں۔
- سوالوں کو دہرانے سے گریز کریں۔
- پیشگی تیاری اور پیشگی مطالعے کے بغیر حد سے زیادہ پُر اعتمادی کے ساتھ انٹرویو نہ لیں۔
- اُکتا دینے والے، تھکا دینے والے اور بے اثر سوال پوچھنے سے پرہیز کریں۔
- انٹرویو کے دوران مضحکہ خیز حرکات و سکنات سے بچیں۔
- انٹرویو لینے والے کو چاہیے کہ وہ انٹرویو دینے والے سے زیادہ نہ بولے۔
- انٹرویو مقررہ وقت میں مکمل کر لیں۔

بالمشافہ انٹرویو، رسالوں میں شائع شدہ انٹرویو، آکاش وانی پر لیے گئے انٹرویو، ٹیلی وِژن پر لیے گئے سمعی و بصری انٹرویو، جائے وقوع پر لیے گئے انٹرویو جیسے مختلف قسم کے انٹرویو نے آج کی عوامی زندگی کے اندرون و بیرون کا احاطہ کر رکھا ہے۔

فرد میں 'شخصیت' کی تلاش کرنے والا، پڑھنے والوں کو چونکا دینے والا، بامعنی، فکر انگیز اور زندگی سے بھرپور انٹرویو معاشرے کی بہتری کا باعث بنتا ہے۔ انٹرویو کے یہ نتائج ذہن میں رکھیں تو انٹرویو کے معنی مزید واضح کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔

مشقی سرگرمیاں

(الف) جواب دیجیے۔

۱۔ انٹرویو کی پیشگی تیاری کیسے کریں گے؟

۲۔ انٹرویو کا اختتام کیسے کریں گے؟

۳۔ واضح کیجیے کہ انٹرویو کسی فرد کی کارکردگی کی شناخت ہوتا ہے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب لکھیے۔

۱۔ انٹرویو کے خاص مقاصد اپنے الفاظ میں واضح کیجیے۔

۲۔ واضح کیجیے کہ انٹرویو کے معنی منصوبہ بند مکالمہ ہیں۔

۳۔ واضح کیجیے کہ فرد میں 'شخصیت' کی تلاش کے لیے انٹرویو لیے جاتے ہیں۔

۴۔ انٹرویو لیتے وقت برتی جانے والی احتیاط لکھیے۔

۵۔ اُمیدوار کا 'اندرون' جاننے کے لیے انٹرویو ضروری ہے۔ مثالوں کے ساتھ وضاحت کیجیے۔

(ج) انٹرویو کی پیشگی تیاری کیسے کریں گے، اسے درج ذیل نکات کی مدد سے لکھیے۔

- انٹرویو دینے والے شخص کی معلومات۔
- انٹرویو دینے والے شخص کی کارکردگی۔
- انٹرویو کے تعلق سے مطالعہ۔
- سوالوں کی تیاری۔

(د) درج ذیل افراد کا انٹرویو لینے کے لیے سوال نامہ ترتیب دیجیے۔

۱۔ سبزی فروش

۲۔ ڈاکیا

۳۔ نرس

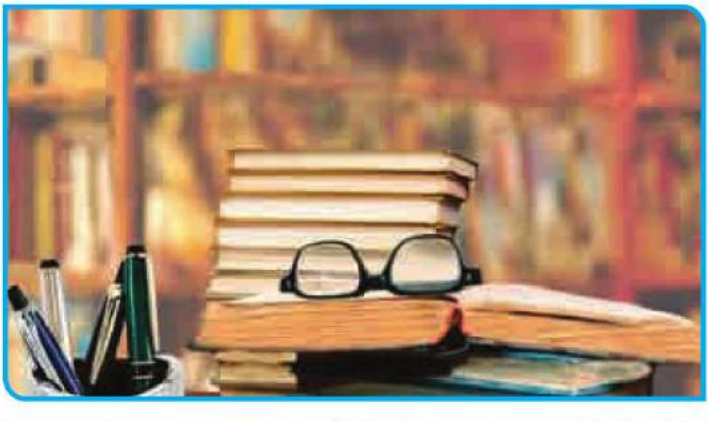

۲ تعارف نامہ

تمہید

آج کے مسابقتی دور میں عالم کاری اور تجارتی عمل کی وجہ سے گاہک (صارف) خرید و فروخت کے معاملات میں بڑے بیدار ہو گئے ہیں۔ کوئی معاملہ کرتے وقت لوگوں کو متعلقہ معاملے کے تعلق سے تفصیلی معلومات درکار ہوتی ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ انھیں یہ معلومات گھر بیٹھے تحریری طور پر حاصل ہو جائے۔ لوگوں کے اس رجحان کو تاجروں، سماجی، تعلیمی اور مالیاتی اداروں نیز صنعت کاروں اور بیوپاریوں نے سمجھ لیا ہے۔ گاہکوں کی تسکین کے لیے یہ لوگ جو نئے نئے طریقے اور ذرائع استعمال کر رہے ہیں، ان میں سے ایک 'تعارف نامہ' ہے۔

ہیئت

تعارف نامہ یعنی منفرد معلومات والا ورقیہ۔ تعارف نامہ موضوعات، خدمات، شعبہ جات کو لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ لوگوں کو نئے نئے منصوبوں کی جانب راغب کرنے کا کام کرتا ہے۔ تعارف نامے کی وجہ سے معلومات دینے اور معلومات حاصل کرنے والوں کے درمیان ایک رشتہ قائم ہونے میں مدد ملتی ہے۔ 'تعارف نامہ' نئے گاہک کے حصول اور نئے بازار پر غلبہ حاصل کرنے کا پہلا زینہ ہے۔ گاہک کو تعارف نامے کے ذریعے ضروری معلومات ہمیشہ دستیاب ہو سکتی ہے۔ اسے کم وقت اور کم خرچ میں گاہک کے مکان تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ تعارف نامہ بالواسطہ طور پر اشتہار کا کام کرتا ہے۔ اسے پڑھتے وقت اشیاءِ فروخت سے متعلق لوگوں میں اشتیاق، خواہش اور دلچسپی پیدا ہو تو سمجھیں کہ تعارف نامے کا مقصد حاصل ہو گیا۔

تعارف نامے کی ضرورت اور افادیت

تعارف نامے کی ضرورت ہر جگہ ہوتی ہے۔ پھلوں، ترکاریوں کی آڑھت کرنے والوں سے لے کر لاکھوں روپوں کی عالی شان کاروں کے تاجروں تک کے لیے تعارف نامہ ضروری ہے۔ آج کل عید اور تہواروں کا سامان، تیار کپڑوں، ساڑیوں، کھلونوں، پنساریوں، کتابوں، اسٹیشنری، گاڑیوں، ہوٹلوں، جشن ہال، اوزاروں، کارخانوں، الیکٹرانک اشیا، دواؤں، ڈیری مصنوعات، غذائی اشیا، گھریلو استعمال کی چیزوں کے تعارف نامے بھی نظر آتے ہیں۔ ڈراما، تھیئٹر، سنیما گھر، امدادِ باہمی، مالیاتی اور تعلیمی ادارے، سماجی اور ادبی ادارے، ثقافتی اور کھیل کود کے ادارے، کمپنیاں، اسپتال، سیاحت کے مراکز، ایل.آئی.سی.، ڈاک، بنک، بچت گٹ وغیرہ کو تعارف ناموں کی ضرورت ہوتی ہے۔

فن، موسیقی، چھوٹے بڑے کورسیس، زراعتی آلات، تعمیری آلات، دوا ساز کمپنیاں، پودگھر (نرسری) جیسے کئی شعبے ہیں جن کی طرف عوام کو راغب کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے تعارف نامہ ضروری ہے۔ آپ کی انفرادیت، آپ سے گاہک کو ہونے والا فائدہ ایسے نکات ہیں جنھیں نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے تعارف نامے کی ضرورت ہوتی ہے۔

تعارف نامے کے تشکیلی خاکے کی خصوصیات:

• معلومات کو ترجیح

تعارف نامے میں معلومات کو ترجیح دی جانی چاہیے۔ اس مقصد کے تحت درست معلومات دینا ضروری ہے۔ معلومات واضح اور مختصر ہونی چاہیے۔ ادارے سے متعلق ضروری اور قانونی معلومات (مثلاً ادارے کا رجسٹریشن نمبر، ادارے کے رجسٹریشن کی تاریخ، فون نمبر، ای-میل، ویب سائٹ، ادارے کا نشان، نعرہ، پتا، عہدیداران کے نام، اوقاتِ کار وغیرہ) تعارف نامے میں لازماً دی جانی چاہیے۔ تعارف نامے میں دی جانے والی معلومات معروضی، درست اور مصدقہ ہونی چاہیے۔ اس میں مبالغہ آمیز اور جھوٹی معلومات نہیں دی جانی چاہیے۔ تعارف نامے میں دی گئی معلومات کی زبان عام فہم ہونی چاہیے۔ اس میں اضافی معلومات سے گریز کرنا چاہیے۔

• افادیت

تعارف نامہ کس طرح مفید اور مؤثر ہوسکتا ہے، اس جانب توجہ دینا ضروری ہے۔ لوگوں میں اسے پڑھ کر پھینکنے کی بجائے حفاظت سے رکھنے اور اسے حوالے کے لیے دوبارہ پڑھنے کی خواہش پیدا ہونی چاہیے۔ ایسا مفید تعارف نامہ تب ہی بن سکتا ہے جب اس میں درج معلومات گاہک کے دل کو چھوئے۔ 'میری روزمرہ زندگی کے مسائل'، رکاوٹیں، سوالات کو حل کرنے کے لیے تعارف نامہ مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ گاہک کو اس طرح کا احساس دلانے والا تعارف نامہ فائدہ مند ہی ہوتا ہے۔ تعارف نامے میں درج جملوں 'کیا آپ کی ترکاریوں پر حشرات کش دواؤں کا ضرورت سے زیادہ چھڑکاؤ کیا گیا ہے؟، دودھ میں ملاوٹ کی جانچ اس طرح کریں' کے اعلان کی جانب گاہک کے متوجہ ہونے پر شہری افراد کو بھی زرعی نمائش کا تعارف نامہ فائدہ مند محسوس ہوتا ہے۔

• انفرادیت

اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ آپ کا تعارف نامہ اوروں کے تعارف ناموں کی بہ نسبت ہر طرح سے مختلف اور نمایاں ہو۔ فرق تعارف نامے کے متن اور تشکیل میں ہونا چاہیے۔ دوسروں سے مختلف، نئی، دلچسپ، فائدہ مند معلومات دینا اور مختلف لے آؤٹ، سائز، ترتیب اور مختلف نقطہ نظر کے ذریعے تعارف نامے کو منفرد اور ممتاز بنایا جاسکتا ہے۔

• دلکش لے آؤٹ

تعارف نامے میں معلومات کی ترتیب سیدھی سادی نہیں بلکہ دلکش ہونی چاہیے۔ تعارف نامہ ایسا پرکشش اور دلچسپ ہونا چاہیے کہ دیکھتے ہی اسے پڑھنے کی خواہش ہونی چاہے۔ اس کا کاغذ بہترین، طباعت رنگین اور سرورق دیدہ زیب ہونا چاہیے۔ اس کا سائز مناسب ہو۔ اس کا موضوع اور نعرہ واضح طور پر نظر آنا چاہیے۔ تعارف نامے کی عمدہ ترتیب کے لیے ماہرِ فن، مصوّر، کمپیوٹر کے ماہر سے مدد لینا چاہیے۔

• زبان

تعارف نامہ صرف دیکھا نہیں بلکہ پڑھا جاتا ہے اس لیے اس کا طرزِ تحریر دلچسپ اور راغب کرنے والا ہونا چاہیے مثلاً 'ہمارے

زرعی سیاحتی مرکز میں قیام کرکے آپ بہت خوش ہوں گے۔ یہاں آپ اتنے کھو جائیں گے کہ آپ کو دُکھ کے متعلق سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملے گی۔' یہ تمام معلومات آپ اور مختصر کرکے اس طرح بھی بیان کرسکتے ہیں :'اب تناؤ کے لیے وقت نہیں۔' اس طرح الفاظ کی ترتیب دلچسپ ہو۔ مختصراً زبان و بیان دل کو چھونے والا ہو۔

تعارف نامے کا تشکیلی خاکہ

کسی جونیئر کالج میں نئے تعلیمی سال سے شعبۂ سائنس کا آغاز کرنا ہے۔ اس کی اطلاع داخلے کے خواہش مند طلبہ اور ان کے سرپرستوں تک مؤثر طریقے سے پہنچانا ہے۔ اس کے ذریعے طلبہ داخلے کے لیے جونیئر کالج سے رابطہ کریں گے۔ یہ اطلاع ان تک کس طرح پہنچائی جاسکتی ہے؟

یقیناً یہ کام تعارف نامے کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔

تعارف نامے میں کون کون سے نکات ہونے چاہئیں۔

(۱) جونیئر کالج جس تعلیمی انجمن کے ذریعے چلایا جاتا ہے، اس کا مخصوص نشان (لوگو)، انجمن کا نعرہ، انجمن کے اہم عہدیداروں کے نام۔

(۲) انجمن کا نام، پتا، سنۂ تاسیس، فون نمبر/ موبائل نمبر، ای-میل، ویب سائٹ۔

(۳) جونیئر کالج کا نام، پتا، سنۂ تاسیس، فون نمبر/ موبائل نمبر، ای-میل، ویب سائٹ۔

(۴) انجمن اور جونیئر کالج کی سرکاری منظوری/ منظوری سے متعلق مختصر معلومات۔

(۵) جونیئر کالج کے تعلق سے بنیادی معلومات (مثلاً سرکاری/ خانگی/ امدادی/ غیر امدادی وغیرہ)

(۶) جونیئر کالج کا مختصر پس منظر۔

(۷) ضروری اعداد وشمار۔

(۸) جونیئر کالج میں دستیاب سہولتیں (مثلاً بیت الخلا، تجربہ گاہ، کھیل کا میدان، اسمبلی ہال، لائبریری، کمرۂ مطالعہ، ہاسٹل، پارکنگ، کینٹین وغیرہ)

(۹) جونیئر کالج کی دیگر خصوصیات۔

(۱۰) جونیئر کالج میں ہونے والی سرگرمیاں (مثلاً پڑھتے پڑھتے کمائیے، این.ایس.ایس.، سیاحت وغیرہ)

(۱۱) تصاویر۔

(۱۲) انجمن کے دیگر کالجوں کے نتائج۔

(۱۳) جونیئر کالج کے مستقبل کے منصوبے۔

(۱۴) طلبہ کو دی جانے والی تعلیمی سہولتیں (اسکالرشپ) وغیرہ۔

(۱۵) جونیئر کالج کو جانے والے راستے کی معلومات/ نقشہ۔

(۱۶) داخلے سے متعلق معلومات، نشستیں، شرائط، مطلوبہ دستاویزات، اہلیت، آخری تاریخ، داخلہ فارم کا نمونہ، فیس، ابتدا میں ادا کی جانے والی رقم، متعلقہ کورس کی مدت، داخلے کے دوران اوقاتِ کار، تعطیلات، متعلقہ ذمہ داروں کے نام، ان کے فون نمبر، داخلے کے قطعیت کی تاریخ (منتخبہ طلبہ کے ناموں کی فہرست کا اعلان)، تعلیمی سال کے آغاز کی تاریخ سے متعلق معلومات۔

آج کے دور میں درست معلومات بہم پہنچانے والا پرکشش تعارف نامہ تیار کرنا تاجروں کی ضرورت ہے اور اس کا بروقت دستیاب ہونا گاہکوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے تعارف نامے کی تیاری کو پیشہ ورانہ اہمیت حاصل ہورہی ہے۔

مشقی سرگرمیاں

(الف) **مثال کے ساتھ تعارف نامے کی وضاحت کیجیے۔**

(ب) **درج ذیل نکات کی مدد سے تعارف نامے کی خصوصیات واضح کیجیے۔**

۱۔ دیدہ زیب پیشکش

۲۔ زبان

(ج) **مختصر معلومات دیجیے۔**

۱۔ وہ شعبے جن میں تعارف ناموں کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۔ تعارف نامہ دراصل اشتہار ہی کی ایک قسم ہے۔

(د) **اپنے لفظوں میں تعارف نامے کے فائدے واضح کیجیے۔**

(ہ) **کسی ہوٹل میں کھانوں کی معلومات دینے کے لیے تعارف نامے میں کن نکات کی شمولیت ہوتی ہے، لکھیے۔**

(و) **کسی کپڑے کی دکان کا تعارف نامہ ترتیب دیجیے۔**

۳ روداد نویسی

تمہید

اسکولوں اور کالجوں میں تقریری مقابلے، کھیلوں کے مقابلے، ثقافتی تقاریب یا پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح سیاسی، سماجی اور مالیاتی اداروں کے پروگرام بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ان پروگراموں کے اختتام پر ان کی رودادیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ رودادیں مستقبل میں نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے ذریعے قارئین کو منعقد کیے گئے پروگراموں اور تقریبوں کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے روداد کی تعریف، اس کی اہمیت، روداد کا خاکہ، روداد نویسی کے اُصول، روداد لکھتے وقت برتی جانے والی احتیاطی تدابیر وغیرہ کا علم ہونا ضروری ہے۔ یہ ساری تفصیلات روداد نویسی اور روداد کی قرأت میں مدد کرتی ہیں۔

ہیئت

کسی دفتر یا ادارے میں منعقدہ پروگرام یا تقریب کا احوال مناسب طریقے سے ضبطِ تحریر میں لانا 'روداد نویسی' کہلاتا ہے۔ تقریب کی تفصیل لکھتے وقت تقریب کا مقصد، اس کی تاریخ اور وقت، شرکاءِ جلسہ، کارروائی، اختتام وغیرہ نکات شامل کیے جاتے ہیں۔ پروگرام کی ابتدا سے لے کر اس کے اختتام تک کی مرحلہ وار مناسب تفصیل روداد میں شامل کی جاتی ہے۔ کسی مسئلے کے متعلق معلومات حاصل کر کے اس کی پیچیدگیوں کا جائزہ لینے کے لیے خاص طور پر اس مسئلے کے حل کے لیے مقرر کیے گئے کمیشن کے احوال کو روداد کہتے ہیں۔ اسی طرح ترقی کی روداد، تفتیشی روداد، معلوماتی روداد، تحقیقی روداد، ماہانہ روداد اور سالانہ روداد جیسی مختلف قسم کی رودادیں ہوتی ہیں۔

تقریبات کے احوال اگر تحریری طور پر محفوظ نہ کر لیے جائیں تو اداروں کی ترقی اور ان کے کارہائے نمایاں کی تفصیل حاصل کرنے میں مستقبل میں دشواری ہوگی۔ اس دشواری سے بچنے کے لیے روداد کو ضبطِ تحریر میں لانا بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔ آئندہ زمانے کی منصوبہ بندی کے لیے بھی روداد مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ مختلف اداروں، چھوٹی بڑی صنعتوں اور گرام پنچایت سے لے کر کارپوریشنوں تک میں ہوئے عملی اقدامات اور تبدیلیوں کی صداقت کو جانچنے کے لیے ان کی روداد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کسی مسئلے کے متعلق مناسب فیصلے کے لیے، عوامی مقام پر کسی نہایت اہم منصوبے یا صنعت کو جاری کرنا ہو تو اوّلاً ان کی روداد جمع کرنی ہوتی ہے۔

روداد کا خاکہ

دراصل جس واقعے کے احوال قلم بند کرنے ہوتے ہیں، انھی کی بنیاد پر روداد کا خاکہ تیار کیا جاتا ہے۔ کسی ادارے کے عملی میدان اور مقاصد کے مطابق روداد کے نکات تبدیل ہوتے ہیں۔ کسی کالج کے تقریری مقابلے اور کھیل کے مقابلے کے احوال کی روداد میں فرق ہو سکتا ہے کیونکہ کھیل اور تقریر کے مقابلے کی نوعیت دونوں جدا جدا ہوتی ہے۔

موضوع کی مناسبت سے روداد کی تحریر، ان کے مراحل، ان کی اکائیاں، ان کے جزوی موضوعات، ان کے مدارج وغیرہ میں

کسی حد تک فرق کی گنجائش رہے گی۔

روداد نویسی کے چار مراحل:

۱۔ تمہید (روداد کا آغاز)

۲۔ روداد کا درمیانی مرحلہ (تفصیل)

۳۔ روداد کا اختتامی مرحلہ (اختتامیہ)

۴۔ روداد کی زبان

بطور مثال درج بالا نکات کی روشنی میں دیکھیں گے کہ کسی ثقافتی تقریب کے احوال کی روداد کا خاکہ کس طرح ہوسکتا ہے۔

روداد کا موضوع: ''یومِ اُردو/ اُردو کی ترویج وترقی کا ہفتہ/عشرہ'' - اختتامی تقریب کی روداد

تمہید

اس میں حسبِ ذیل نکات کا اندراج متوقع ہے۔ جلسے کا موضوع، مقامِ جلسہ، تاریخ، دن، وقت، نوعیت، صدر کا نام اور عہدہ، مہمانِ خصوصی کا نام اور عہدہ، جلسے کے منتظمین کے نام اور عہدے، دیگر مندوبین کی تفصیل، ان تمام کے لیے توصیفی کلمات/ استقبال، تلاوتِ قرآن، حمد، نعت خوانی، استقبالیہ گیت وغیرہ کا ذکر بھی تمہید (آغاز) میں ہوتا ہے۔

روداد کا درمیانی مرحلہ

اُردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے منائے گئے یوم/ ہفتے /عشرے کا مقصد، اس کی منصوبہ بندی، کون کون شامل تھے، کون سی سرگرمیاں عمل میں آئیں، ان سرگرمیوں سے کیا حاصل ہوا، اس حوالے سے آئندہ کی منصوبہ بندی، اس کی تنظیم کیسے کی گئی، اس کے بارے میں ہر نکتے کی ترتیب وار وضاحت کی توقع کی جاتی ہے۔ اس تقریب میں حصہ لینے والے طلبہ واساتذہ کے تاثرات کا اندراج بھی متوقع ہے۔ مہمانانِ خصوصی کے خیالات اور صدر کی تقریر، پیش کردہ دو تین خاص سرگرمیوں کا تذکرہ، تقسیمِ انعامات کی تفصیل وغیرہ روداد کے اس حصے میں شامل کرنا متوقع ہوتا ہے۔

روداد کا اختتامی مرحلہ

تقریب کے اہم نکات، تقریب کی کامیابی اور اس میں پائی گئیں کمیوں کے متعلق حتمی فیصلے کو روداد کے اختتامی حصے میں شامل کرنا متوقع ہوتا ہے۔

روداد کی زبان

ادارے کا شعبۂ کار، موضوعاتِ تقریب، تقریب کی نوعیت وغیرہ کے مطابق روداد میں خاص ناموں اور اصطلاحوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مختلف علاقوں کی رائج زبان میں روداد لکھی جاتی ہے۔

روداد نویسی کی خصوصیات:

• جامع اور واضح

روداد کی نوعیت کی مناسبت سے اس میں تاریخ، دن، وقت، مقام، شرکا کے نام، عہدے، تقریب کی عملی صورت، مقاصد، اعداد و شمار اور نتیجے وغیرہ اہم نکات کا اندراج واضح طور پر اور غلطیوں سے پاک ہونا چاہیے۔

• اعتباریت

روداد میں درج صحیح معلومات روداد کو اعتبار بخشتی ہے۔ روداد کی اسی اعتباریت کی وجہ سے بعض اوقات سنگین مسائل کو حل کرنے کے لیے ثبوت کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ روداد کی اہم خصوصیت ہوسکتی ہے۔

• سہل اور سادہ

یہ توقع کی جاتی ہے کہ ممکنہ حد تک عام آدمی بھی روداد کو بہ آسانی سمجھ سکے۔ اس مفروضے کے تحت جب روداد لکھی جاتی ہے تو قصداً اس کی زبان آسان اور عام فہم رکھی جاتی ہے۔ بلا وجہ اس میں مشکل الفاظ اور پیچیدہ اصطلاحات کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ روداد میں فصیح و بلیغ زبان، ڈرامائی انداز اور صنائع بدائع سے کلّی طور پر اجتناب برتا جاتا ہے مگر روداد میں متعلقہ علاقے کی زبان اور وہاں کی اصطلاحات بالعموم استعمال کی جاتی ہیں۔

• ذخیرۂ الفاظ

روداد کی نوعیت اور موضوع پر روداد میں استعمال ہونے والے الفاظ کی تعداد کا انحصار ہوتا ہے۔ ثقافتی، ادبی اور کھیل کود پر مبنی مقامی سطح کی رودادیں مختصر ہوتی ہیں۔ البتہ سرکاری اداروں کی سالانہ میٹنگوں کی رودادیں قدرے طویل ہوتی ہیں، ان کی نوعیت بھی متعین ہوتی ہے۔

کسی مسئلے یا سرگرمی کے حوالے سے لکھی گئی تحقیقی نوعیت کی روداد یا عوامی مقامات پر قائم صنعتوں، خدماتِ عامہ (اندرونِ شہر آمد و رفت کے وسائل) کے احوال کافی طویل ہوتے ہیں۔ ان میں بہت زیادہ معلومات، اعداد و شمار، مشاہدات، تفصیلات اور نتائج شامل کیے جاتے ہیں۔ کسی تقریب یا جلسے کی روداد تین چار صفحات پر مشتمل ہوتی ہے جبکہ کسی کمیشن کی روداد ہزار یا زائد صفحات کی بھی ہوسکتی ہے۔

• غیر جانبداری

روداد کا موضوع کچھ ہو اور کسی بھی قسم کا ہو، ان تمام کی ایک ہی خصوصیت ہوتی ہے، غیر جانب داری۔ روداد نویس اپنے ذاتی خیالات اور ذاتی رائے کو من مانے طور پر روداد میں شامل کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ اپنی مرضی کے مطابق روداد نہیں لکھ سکتا۔ حقیقت نمایاں کرنے والی تحریر روداد کی گویا روح ہوتی ہے۔ الگ الگ تقریبات، مجلسوں، تحقیقاتی سرگرمیوں میں روداد نویس نے کیا محسوس کیا، کیا دیکھا، کیا سنا وغیرہ تمام جزئیات کی حقیقی تفصیل روداد میں ہوتی ہے۔

رودادنویسی کے لیے غور طلب اُمور :

رودادنویسی اگرچہ ادب کی صنف نہیں لیکن یہ تحریر کا ایک ہنر ہے۔ کوٹھاری کمیشن کی روداد کا پہلا ہی جملہ :

The destiny of India is being shaped in her classrooms. (بھارت کی تقدیر جماعت کے کمروں میں تشکیل پا رہی ہے) اس طرح کے خوب صورت، رہنما اور فکر انگیز جملوں نیز خیالات کی وجہ سے روداد پُرکشش بنتی ہے اور ضرورت کے مطابق اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

رودادنویسی کے وقت درج ذیل امور کا خیال رکھا جائے :

(۱) رودادنویس کو متعلقہ موضوع کا اچھا علم ہو۔

(۲) جو واقعہ رونما ہوا اور جیسا ہوا، اس کے مطابق روداد لکھی جانی چاہیے۔

(۳) رودادنویسی کے لیے زبان پر مکمل دسترس ہونی چاہیے۔ بالخصوص ثقافتی تقاریب کی روداد قلم بند کرتے وقت منظرکشی میں جان پیدا ہو جائے۔ اس کے برخلاف تحقیقاتی سطح کے احوال لکھتے وقت مناسب اور موزوں اصطلاحات کا استعمال کیا جانا چاہیے۔

(۴) خلاصے کی صورت میں مختصر نویسی کی مشق ہونی چاہیے۔

(۵) تحریر کا اسلوب سادہ، آسان اور فطری ہونا چاہیے۔ اس میں صناعی، ڈرامائیت اور مبالغے کا گزر نہ ہو۔

(۶) شرکا کے نام اور ان کے عہدوں میں غلطیاں نہ ہوں۔ اسی طرح واقعات کے بیان میں تسلسل اور ربط کا ہونا لازمی ہے۔ روداد لکھتے وقت تکنیکی امور (سرنامہ/ سرخی، تاریخ، مقام، مہمانانِ خصوصی، صدر، نام، عہدے وغیرہ) کے نقل کرنے میں غلطی اور بھول چوک نہ ہو۔

(۷) رودادنویس میں باریک بینی اور قوتِ مشاہدہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس میں روداد کے موضوع کی نوعیت، انفرادیت اور خصوصیات کا مشاہدہ باریک بینی سے کرنے کی مہارت ہو۔

(۸) روداد میں موضوع کی رو میں بہہ جانے والے اپنے خیالات کا اظہار نہ ہو۔

(۹) روداد متعلقہ تقریب اور موضوع سے باہم مربوط ہونی چاہیے۔ وہ نامکمل اور غیر مربوط نہ ہو۔

(۱۰) روداد کی تکمیل کے بعد اس کے نیچے صدر اور سکریٹری کے تائیدی دستخط ہونے لازمی ہیں۔

روداد متعلقہ ادارے کی تقریب کی اہم دستاویز ہوتی ہے اس لیے اس کو لکھتے وقت نہایت احتیاط لازمی ہے۔ ادارے یا دفتر کے کاموں کی طویل مدتی جانچ کے وقت ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے انھیں محفوظ رکھا جانا چاہیے۔

مشقی سرگرمیاں

(الف) روداد کی ہیئت بیان کیجیے۔

(ب) روداد کی ضرورت بیان کیجیے۔

(ج) حقیقت نمایاں کرنے والی تحریریں روداد کی روح ہوتی ہیں۔ واضح کیجیے۔

(د) درج ذیل نکات کی روشنی میں روداد نویسی کی خصوصیات واضح کیجیے۔

- جامع اور واضح
- ذخیرۂ الفاظ
- غیر جانب داری

(ہ) روداد قلم بند کرتے وقت غور طلب اُمور میں سے مثالوں کے ذریعے دو کی وضاحت کیجیے۔

(و) درج ذیل عنوانات پر روداد لکھیے۔

۱۔ آپ کے جونیئر کالج کا سالانہ جشن

۲۔ آپ کے جونیئر کالج میں شجر کاری کی مہم

۴

فیچر نویسی

تمہید

ہماری زندگی خبروں سے بھری پڑی ہے۔ ریڈیو کے ذریعے خبریں ہم تک پہنچتی ہیں۔ ٹیلی وِژن پر ہم خبریں سنتے اور دیکھتے بھی ہیں۔ اخباروں میں خبریں پڑھنے کے بعد بھی تجسّس ختم نہیں ہوتا۔ خبر جس واقعے پر مبنی ہو، پڑھنے والے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اخبارات قارئین کے اس تجسّس کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ان کا مقصد معلومات بہم پہنچانا ہے۔ اسی کے ساتھ اخبارات ہمارے سماج میں عوامی بیداری، تعلیم و تربیت اور تفریحِ طبع کا عمل بھی انجام دیتے ہیں۔ خبر میں ماجراجوں کا توں بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں خبر نگار کے 'مَیں' کی گنجائش نہیں ہوتی۔ واقعے کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنا خبر کی ضرورت ہے۔ البتہ جو چیزیں خبر میں نہیں ہوتیں مثلاً دلچسپی، انوکھا پن، خبر کی باریکیاں اور طرح طرح کی تفصیلات، یہ تمام باتیں فیچر میں موجود ہوتی ہیں۔

ہیئت

بعض خبریں ایسی ہوتی ہیں جن کے پیچھے چُھپی ہوئی تفصیلات سے قارئین کو واقف کرانا ضروری ہوتا ہے لیکن خبر میں اس کا موقع نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لیے جو مضمون لکھا جاتا ہے اسے فیچر کہتے ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں فیچر کی تعریف حسبِ ذیل ہے :

It is a non news article in a newspaper

اس سے مراد خبر کے پیچھے چُھپی اہم اور دلچسپ باتیں ہیں۔ اخبار مغربی ملکوں کی پیداوار ہے اسی لیے بھارت کی صحافت میں بھی وہاں کے کئی تصوّرات شامل ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ایک فیچر بھی ہے جو اخبار پڑھنے والوں کی ضرورت بن چکا ہے۔ خبر جس واقعے سے متعلق ہو اس کی تفصیلات قارئین تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے۔ اسی مقصد سے فیچر لکھا جاتا ہے۔ فیچر کو 'نان نیوز آرٹیکل' کہا گیا ہے، تاہم اس کا تعلق ہمیشہ خبر سے ہوتا ہے۔ اس کی تازگی برقرار رکھنا ضروری ہے۔ فیچر وقوع پذیر ہونے والے اور پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہوتا ہے۔ اسے 'ہنگامی تحریر' بھی کہا جاتا ہے۔ فیچر فوری طور پر لکھی جانے والی تحریر ہے۔ اس کے باوجود اس میں غلطیوں سے دامن بچانا ضروری ہے کیونکہ حقیقت پر مبنی ہونے کے سبب اس میں خیال آرائی کی گنجائش ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیچر خبر کو پُرلطف بناتا ہے اور وہ پڑھنے والوں کے احساسات کا خیال رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ قارئین کی تسکین ضروری ہے۔

فیچر ایک منفرد قسم کی تحریر ہے جس کی مخصوص خوبیاں ہیں۔ فیچر کا اسلوب اور اس کی دلکشی قارئین کو باندھے رکھتی ہے۔ اس کی زبان سادہ، عام فہم اور اپنائیت سے بھرپور ہوتی ہے۔ کم لفظوں میں وسیع مفہوم بیان کرنے کے علاوہ قارئین کے دلوں تک پہنچنے کی صلاحیت بھی اس میں ضروری ہے۔ ظاہر ہے زبان پر ایسی قدرت بڑی مشق و محنت کے بعد ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ فیچر کے مطالعے سے قارئین کو مسرّت، تفریح اور معلومات حاصل ہوتی ہے۔ اس سے مطالعے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ فیچر کبھی کبھی اپنے پڑھنے والوں کو چونکاتا ہے اور اس کا موضوع، اسلوب اور مواد انھیں دعوتِ فکر بھی دیتا ہے۔ اپنی بات کو مؤثر انداز سے پیش کرنے کے لیے اس میں اعداد و شمار، تصاویر، کارٹون، ترسیم اور جدول کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ فیچر میں اپنے تجربات اور اس موضوع سے متعلق معلومات بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

فیچر کی قسمیں:

موضوع اور تحریر کے اعتبار سے فیچر کی اہم قسمیں درج ذیل ہیں ۔

خبر پر مبنی فیچر: کسی خبر کے سیاق وسباق میں یہ فیچر لکھا جاتا ہے ۔اس میں خبر کا تجزیہ بھی کیا جاتا ہے ۔اخبار میں شائع ہونے والی خبر کی تمام معلومات اس فیچر میں نہیں ہوتی البتہ اہم نکات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ لکھنے والے کے پاس اس موضوع پر تازہ معلومات موجود ہوتی ہے ۔اکثر اس شعبے کے ماہرین سے مل کر اور اس خبر کی گہرائی تک پہنچ کر فیچر لکھا جاتا ہے۔ قارئین کے لیے یہ نئی معلومات مسرت بخش ثابت ہوتی ہے ۔

فیچر کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس میں قومی، بین الاقوامی، شہری، دیہی، سماجی، تعلیمی، ثقافتی، صنعتی اور سیاسی ہر قسم کے موضوعات کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر آلودگی : اس موضوع کے تحت دہلی میں بڑھتی ہوئی فضائی آلودگی، اس کے اسباب، انسانی صحت پر اس کے مضر اثرات وغیرہ کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ نقل وحمل کے ذرائع پر سرمایہ کاری، مویشی پالن میں کمی اور اس کے سماج پر اثرات جیسے موضوعات بھی ہو سکتے ہیں ۔

سوانحی فیچر: سماج میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے افراد سے متعلق بھی فیچر لکھا جاسکتا ہے۔ کسی مخصوص اہمیت کا حامل کوئی کام، کسی خاص شعبے میں غیر معمولی کامیابی کا حصول، کسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے یا کسی منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کی گئی کوششیں یا کوئی کارنامہ فیچر کا موضوع ہوسکتا ہے۔ کسی شخص کے انعام سے سرفراز کیے جانے پر، کسی کی سالگرہ پر، کسی مشہور شخصیت کے یومِ وفات پر یا کسی ادارے کے جشنِ سیمیں یا کسی خاص موقعے پر فیچر لکھا جاسکتا ہے ۔

شخصیات سے متعلق فیچر تیار کرتے وقت کئی وسائل کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ کسی شخص سے متعلق شائع ہونے والے مضامین، اس کی سوانح، آپ بیتی یا اس کے ساتھ کام کرنے والوں، اس کے دوستوں، رشتے داروں سے لیے گئے انٹرویو وغیرہ کے ذریعے معلومات حاصل کر کے عمدہ فیچر تحریر کیا جاسکتا ہے ۔ایسے فیچر ماہ وسال کی تفصیلات، اعداد وشمار اور تعارف تک محدود نہیں ہوتے بلکہ اس تحریر سے اس شخص کے طرزِ حیات، انفرادی خصوصیات، عادات و اطوار وغیرہ کے متعلق واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کی تحریروں کی ایک اہم خوبی ان میں پایا جانے والا جذبات کا اظہار ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے ۔

انٹرویو پر مبنی فیچر: مختلف شعبوں میں لوگ غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، ان کے انٹرویو پر مبنی فیچر شائع کیے جاتے ہیں۔ ان میں افراد کی فرض شناسی، ان کا منفرد زاویۂ نظر، اس شعبے میں ان کی دریافت یا اختراع کے علاوہ ان کا کوئی نا قابلِ فراموش سفر، ان کی کامیابی یا تجربات ومشاہدات بیان کیے جاتے ہیں ۔اس فیچر میں عام لوگ جن چیزوں سے واقف ہیں اس سے الگ کچھ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جس سے انٹرویو لیا گیا ہے اس کے موقف کو واضح کیا جاتا ہے ۔اس قسم کے انٹرویو میں افراد کی غیر معمولی کامیابی یا کسی شعبے میں ان کی قابلِ ذکر کارکردگی کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوہ پیما، محقق، مشہور ادیب یا شاعر، سیاست داں، ماہرِ تعلیم وغیرہ اہم شخصیات کے انٹرویو کی مدد سے یہ فیچر لکھے جاتے ہیں ۔

تاریخی مقامات سے متعلق فیچر: مختلف شہروں اور قصبوں کو تاریخی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کہیں کھدائی کے دوران دفینے،

کتبے، پرانے سکّے، دستاویزات اور تام رپٹ وغیرہ نکل آتے ہیں اور ان سے کسی علاقے کے متعلق نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ کبھی ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے بیانات سے نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان سب کی مدد سے کسی تاریخی مقام کے بارے میں فیچر لکھا جا سکتا ہے۔ فیچر تحریر کرنے والا ان مقامات کی سیر کرتا ہے اور وہاں سے حاصل ہونے والی معلومات کے سہارے فیچر لکھتا ہے۔ اس میں مشاہدات، تجربات، کسی تاریخ کے ماہر سے ہونے والی گفتگو یا تقریر سے معلوم ہونے والی باتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس قسم کے فیچر کے لیے تصاویر اور نقشوں کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے مثلاً احمد نگر کا زمینی قلعہ، شنی وار واڑا، بی بی کے مقبرے کی سنگ تراشی وغیرہ۔

انوکھے، پراسرار اور حیرت انگیز موضوعات پر مبنی فیچر: عام طور پر کسی علاقے کے عجیب وغریب قدرتی مناظر، کوئی پراسرار واقعہ، کوئی کرشمہ وغیرہ اس قسم کے فیچر کا موضوع ہوتا ہے۔ اس قسم کے فیچر لکھتے ہوئے واقعات یا حالات کی تصدیق ضروری ہے۔ معلومات معتبر اور مصدقہ ہونی چاہیے مثلاً سانگلی کے سیلاب کے پانی کی سطح کا ۵۸ فٹ تک پہنچ جانا، ہمالیہ کے قدرتی مناظر، بڑے حادثے میں کسی بچے کا محفوظ رہ جانا، کسی کسان کا پانی ڈھو کر سیکڑوں درختوں کی آبیاری کرنا اور انھیں زندہ رکھنا وغیرہ واقعات اس قسم کے فیچر میں جگہ پا سکتے ہیں۔

فیچر کے موضوعات کے ماخذ:

صحافت کے شعبے میں کام کرنے والے لوگوں کو طرح طرح کے افراد سے ملاقات کے مواقع ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے اپنے مشاہدات، تجربات، مختلف اخباروں میں شائع ہونے والی خبروں، رسائل، کتابوں، ٹیلی وِژن کی خبروں وغیرہ سے فیچر کے موضوعات مل جاتے ہیں۔ اس قسم کے ذرائع درج ذیل ہیں:

۱۔ **خبریں:** اخبار میں شائع ہونے والی خبریں، مختلف رسائل کے خاص نمبر، کتابیں یا ٹی وی پر پیش کیے گئے واقعات دیکھ کر ذہن میں فیچر کا خاکہ تیار ہو جاتا ہے۔ ان کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے، انٹرویو لینے اور ان پر غور وخوض کرنے سے ایک اچھے فیچر کے لیے بہ آسانی مواد حاصل ہو جاتا ہے۔

۲۔ **ذاتی تجربات:** صحافت کے شعبے میں خبروں کے حصول میں پیش آنے والے تجربات میں سے بعض تو فیچر کی تیاری میں کام آتے ہیں اور بقیہ شخصی تجربات کے ذخیرے کا حصہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ بس اسٹینڈ پر پھیری والوں کی تنظیم کا قیام، اس قسم کی خبر پڑھ کر پھیری والوں کی تعداد، ان کے پیشے میں مشکلات، ان کی آمدنی، ان کے گزر بسر کے مسائل جیسے معاملات کا احاطہ کر کے فیچر لکھا جا سکتا ہے۔ اس میں اعداد وشمار اہم نہیں ہوتے بلکہ ان کی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔

۳۔ **ملاقات/گفتگو:** ایک صحافی کے لیے بہتر تحریری صلاحیت اور اس کے لیے زبان کا گہرا علم ضروری ہے۔ اسی طرح بات چیت کا ہنر بھی اس کے پیشے کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اسے کبھی اعلیٰ افسران کے ساتھ بات چیت کی ضرورت پیش آ سکتی ہے اور کبھی کسان، مزدور، فنکار، کھلاڑی اور کمپنیوں کے مالکان کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کرنی پڑ سکتی ہے۔ اسی گفتگو کے دوران ان افراد کی شخصیات کے انوکھے پہلو نمایاں ہوتے ہیں مثلاً وِدَربھ میں اپنا کھیت فروخت کر کے چاولوں کی قسموں پر تحقیق کرنے والے شری کھوبرا گڑے نے محقق نہ ہونے کے باوجود اِس میدان میں اہم معلومات حاصل کر کے سماجی فلاح کا ایک اہم کام انجام دیا۔ اس قسم کے افراد یا ان کے خاندان والوں سے مل کر ان کی شخصیت کے کئی انوکھے پہلو معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

۴۔ **مشاہدات :** صحافی کسی راہ سے گزر رہا ہو تب بھی اسے کسی نہ کسی خبر کی بھنک لگ ہی جاتی ہے۔ اس صلاحیت کے بغیر اس شعبے میں کامیابی حاصل کرنا دشوار ہے۔ اسی طرح فیچر لکھنے کے لیے مخصوص نظر اور شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے گرد و پیش واقع ہونے والی سرگرمیوں کا مشاہدہ کر کے ان میں فیچر کا موضوع تلاش کر لینا ایک صحافی کی اہم خوبی ہے۔ تجربات سے واقعات کا پس منظر اور متعلقہ معلومات حاصل کر کے ان کے اثرات کا جائزہ لینے کی صلاحیت فیچر لکھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

ماہِ صیام میں شائع ہونے والی ایک خبر : ''معمر ہونے کے باوجود قُلی نے روزے رکھے۔'' مزید تحقیقات کی جائے تو فیچر کے لیے اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ 'کھیت میں بیل کی جگہ آدمی کا استعمال'، 'چائے کی دکان چلا کر اپنے بچے کو کلکٹر بنایا'، 'تعمیری کام کے لیے بے کار موٹر سائیکل کا استعمال' اس قسم کی خبروں پر دلچسپ فیچر لکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیشہ موضوعات کی تلاش میں رہنا ضروری ہے۔

فیچر نویسی کے سلسلے میں احتیاط :

صحافت کو اب تجارت کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اس لیے قارئین کی ضروریات کا ہمیشہ خیال رکھا جاتا ہے۔ اخباروں کے مالکان قارئین کے ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ قارئین کی تعداد پر اخبار کی فروخت منحصر ہوتی ہے اس لیے قارئین کی ضروریات اور پسند کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔

- **قارئین کی دلچسپی :** صحافت میں قارئین کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ انھی کے ذریعے اخبار کا کاروبار چلتا ہے اور اسے مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے قارئین کی دلچسپی کے پیشِ نظر اخبار میں مختلف تحریروں کو جگہ دی جاتی ہے۔ اگر اخبار دیہی علاقوں میں پڑھا جاتا ہو تو وہاں کے قارئین کی دلچسپی اور پسند کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ان کے لیے مناسب موضوعات اور زبان کو ترجیح دی جاتی ہے۔
- **وقت کی اہمیت :** فیچر لکھتے وقت اس کی منصوبہ بندی اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے حسبِ حال ہو۔ بروقت پیش کی جانے والی تحریریں دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ خبریں پرانی ہو جائیں تو ان پر لکھے گئے فیچر قارئین میں دلچسپی کھو بیٹھتے ہیں۔
- **انوکھا پن :** فیچر محض خبروں کی تفصیل نہیں ہوا کرتا۔ خبر کے پسِ پردہ احساسات اور خیالات کو فیچر میں جگہ دینا ضروری ہے۔ ان کا انوکھا پن فیچر کی جان ہے۔ فیچر میں خبر ہی کو دہرایا جائے تو وہ پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ نہیں ہوتی اس لیے اس خبر کے متعلق تجسّس کو بیدار کرنا اور دلچسپی کو بڑھانا ضروری ہوتا ہے۔ اس خبر سے متعلق انوکھے پہلوؤں کا بیان ہی فیچر کو دلچسپ بناتا ہے۔
- **قارئین کی دلچسپی :** فیچر کی منصوبہ بندی کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ قارئین کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہے۔ اس مقصد کے لیے فیچر کا موضوع، مرکزی خیال، ذیلی عنوانات، تجزیہ، تصاویر اور مختلف جدولوں کے سلسلے میں غور و خوض کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تصاویر کہاں دستیاب ہوں گی اور مواد سے مطابق تصاویر کس طرح پیش کی جائیں، اس بات کا

خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک تصویر ہزار لفظوں پر بھاری ہوتی ہے۔ اس قسم کی منصوبہ بندی سے فیچر لکھنا آسان ہو جاتا ہے۔

فیچر کا طرزِ تحریر:

فیچر کی تشکیل بظاہر خبر ہی کی طرح ہوتی ہے لیکن اس کے انوکھے پن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ فیچر کے ابتدائی حصے میں خبر کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور قارئین کے تجسّس کو بیدار کرنے کے بعد درمیانی حصے میں اس پر بحث کی جاتی ہے۔ آخر میں فیچر لکھنے کا مقصد اور توقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ فیچر کا مقصد اس موضوع پر سیر حاصل معلومات فراہم کرنا یا زندگی کے کسی اہم پہلو سے واقف کروانا نہیں ہے اس لیے اس کی زبان آسان، عام فہم ہو۔ ثقیل الفاظ اور مشکل تراکیب کے استعمال سے پرہیز ضروری ہے۔ مختصر جملے تحریر کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ فیچر لکھنے سے پہلے مطالعہ اور تیاری ضروری ہے۔

صحافت کی ترقی کے سبب مختلف علاقوں میں اخبارات و رسائل کثیر تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ جدید تکنالوجی نے اس شعبے کو ترقی کی شاہراہ پر کھڑا کر دیا ہے۔ 'بریکنگ نیوز' کے زمانے میں خبریں بہت جلد لوگوں تک پہنچ جاتی ہیں لیکن ان خبروں کے متعلق ان کے تجسّس کی تسکین کے لیے فیچر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اسی لیے فیچر کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور فیچر لکھنے والوں کے لیے صحافت کے شعبے میں بہتر روزگار کے مواقع موجود ہیں۔

مشقی سرگرمیاں

(الف) فیچر کی نوعیت تفصیل سے بیان کیجیے۔

(ب) فیچر کی درج ذیل اقسام کے بارے میں اپنے لفظوں میں لکھیے۔

۱۔ سوانحی فیچر

۲۔ تاریخی مقامات سے متعلق فیچر

۳۔ انوکھے، پراسرار اور حیرت انگیز موضوعات پر مبنی فیچر

(ج) فیچر نویسی کے تعلق سے برتی جانے والی احتیاط پر روشنی ڈالیے۔

(د) ملک کے سلگتے موضوعات پر شائع ہونے والی خبروں میں سے کسی ایک پر فیچر لکھیے۔